شاعرِ شباب حضرت الطاف مشہدی کا عدیم النظیر ادبی ماہنامہ

ہم لوگ سرگودہا

جدید اردو ادب کا پیغامبر وقت کے تقاضوں کا ساتھی

جوش ملیح آبادی، جگر مرادآبادی، عبدالحمید عدم، شوکت تھانوی، رشید اختر ندوی، کرشن چندر، ایم۔ اے اختر انصاری، کنیز فاطمہ خاتون حیا، احمد ندیم قاسمی، بنت آصف اور الطاف مشہدی جیسے جیالے فنکار "ہم لوگ" میں نہایت باقاعدگی سے لکھ رہے ہیں۔

رسالہ "ہم لوگ" کا خریدار ہونا اعلیٰ ادبی ذوق کی دلیل ہے۔ آج ہی سالانہ چندہ چھ (-/6) روپے بذریعہ منی آرڈر بھیجکر "ہم لوگ" کے خریدار بن جایئے۔ یا پوسٹ کارڈ لکھکر وی۔ پی طلب کیجئے۔ دس پرچوں کے علاوہ دو عدیم النظیر خاص نمبر بھی حاضر خدمت ہوں گے۔

ملنے کا پتہ

نوازش گیلانی مینجر ماہنامہ "ہم لوگ" بلاک نمبر ۱۸ سرگودہا

(پاکستان)

رومانی دنیا کے سب سے بڑے شاعر

حضرت اختر شیرانی

کے نام

ہند و پاکستان کی معزز ترین خواتین کے لکھے ہوئے رومانی خطوط کا مجموعہ

"فردوسِ اختر"!

کے نام سے شائع ہو چکا ہے

ادیب الملک حضرت اختر شیرانی خواتین میں کس قدر مقبول تھے

یہ آپ کو

فردوسِ اختر

کا مطالعہ بتا دے گا

کتاب صرف ایک ہزار کی تعداد میں شائع کی جا رہی ہے۔ آج ہی اپنا آرڈر بُک کرا لیجئے۔ ورنہ انتظار کی زحمت اُٹھانا پڑے گی

جلد عمدہ — نفیس گردپوش — قیمت صرف ۱۰/ روپے

عوامی کتب خانہ، بلاک ۱۸ سرگودہا

غزل

نظر سے نظر جو کسی نے ملا دی
جوانی مری جھوم کر مسکرا دی

مریضِ محبّت کی ہستی مٹا دی
تبسّم کیا اور بجلی گرا دی

وہ آنکھوں میں جب میکدہ لے کے گزرے
صراحی نے روکا سبو نے صدا دی

جوانی نے لوٹا مجھے اور میں نے
حسینوں میں اپنی جوانی لٹا دی

یہ آنسو نہیں پھول ہیں باغِ دل کے
جہاں رو دیئے ایک جنّت بسا دی

کسی کی نگاہوں نے جب تیر بخشا
تو ناسور نے مسکرا کر دعا دی

گھٹاؤں نے دیکھا سیہ گیسوؤں کو
تو گھبرا کے الطاف گردن جھکا دی

غزل

ساغرِ سرشار کی باتیں کریں
آؤ چشمِ یار کی باتیں کریں

کیا خبر کب آسماں کر دے جدا
ہو سکے تو پیار کی باتیں کریں

دے اجازت آبلہ پائی اگر
وادیٔ پُرخار کی باتیں کریں

جی رہا ہے کوئی جس اقرار پر
اس حسیں انکار کی باتیں کریں

زخمِ دل آلطاف مرجھانے لگے
ابروئے خمدار کی باتیں کریں

غزل

منزل ہے پیچھے اور چلا جا رہا ہوں میں
ہر گام پہ فریبِ ہوس کھا رہا ہوں میں

اک حسنِ برق پاش اِدھر اور اُدھر شراب
دانستہ تلخیوں میں گِھرا جا رہا ہوں میں

منزل ہے میری عرش کی منزل کے اُس طرف
اس پستیٔ نگاہ پہ شرما رہا ہوں میں

جامِ شراب ہاتھ میں پہلو میں آفتاب
دنیائے کیف و نور پہ لہرا رہا ہوں میں

یہ کس نے غم کا روگ عطا کر دیا مجھے؟
سینے میں حسرتوں کو جواں پا رہا ہوں میں

کھویا گیا تھا ان کی نگاہوں کے آس پاس
نیندوں کی وادیوں سے چلا آ رہا ہوں میں

الطاف داستانِ محبت ہے اور آنکھ
خاموش ہے زبان کہے جا رہا ہوں میں

غزل

میخانے مضطرب ہیں کسی کے شباب میں
شعلوں کا رقص دیکھ رہا ہوں شراب میں

آنکھوں میں اوس ہونٹوں پہ مدھم سی چاندنی
تسکین دل کے ساتھ رہی اضطراب میں

زلفوں کی اوٹ میں طوفانِ رنگ و بو
گلشن مہک رہا ہے ردائے سحاب میں

محسوس ہو رہے ہو مگر سامنے نہیں
اک گیت بن گئے ہو تم عہدِ شباب میں

اے اہلِ بزم اور بھی ہاں اور بھی شراب
باقی ہے ایک گونج ابھی تارِ رباب میں

آنکھوں کے سامنے ہیں وہ اللہ رے تابِ دید
سو طور بے قرار تھے جن کے نقاب میں

الطاف پڑ رہا ہے یہ ان گیسوؤں کا عکس
یا تیرتی ہیں بدلیاں جامِ شراب میں

غزل

وہ میرے پاس ہیں دل کو مگر قرار نہیں
چمن میں رہ کے بھی ہیں سرخوشِ بہار نہیں
تمہارے گیسوؤں سے کھیلتے ہیں ہاتھ مرے
اٹھاؤ جام کہ بادل کا انتظار نہیں
میں مِٹ چکا ہوں ترے سنگِ آستاں کی قسم
مگر جبیں مری سجدوں سے داغدار نہیں
بپاسِ حسن یہ جلووں کا احترام تمام
میں رو رہا ہوں مگر آنکھ اشکبار نہیں
میں زندگی کو جواں دیکھنے کا عادی ہوں
مری نظر کو یہ ماحول سازگار نہیں
بنا ہے دل مرا الطاف حسرتوں کا مزار
جہاں میں آج مرا کوئی غمگسار نہیں

غزل

محبت کی شیریں نوا بن گئے تم
مری زیست کا آسرا بن گئے تم

نگاہیں گلابی ادائیں شرابی
ز سر تا بپا میکدا بن گئے تم

مرے سجدہ ہائے جنوں کو نہ بھولو
کہ جن کی بدولت خدا بن گئے تم

تصور کی شمعیں فروزاں ہیں اب تک
ہوا کیا اگر بے وفا بن گئے تم

مجھے ڈوب جانے دو اے ناخداؤ
کہ اب ناخدا سے خُدا بن گئے تم

نظر بہکی بہکی شباب اللہ اللہ
جوانی سے پوچھو کہ کیا بن گئے تم

گھٹا بن کے الطاف رندوں پہ برسے
گلستاں میں بادِ صبا بن گئے تم

غزل

آ چل کے بسیں ہمدمِ دیرینہ کہیں اور
میں ڈھونڈھ نکالوں گا فلک اور زمیں اور

بچتی ہوئی نظروں سے ٹپکتے ہیں فسانے
ایجادِ تکلّم کی ہوئی طرزِ حسیں اور

گلہائے تبسّم پہ نظر ڈالنے والے
ان ہونٹوں میں پنہاں ہیں کئی خلدِ بریں اور

ضوبار و درخشاں ہے یہ انوارِ خودی سے
سجدوں کی سیاہی کو ہے مطلوب جبیں اور

اک اشک میں تبدیل ہوا اپنا سراپا
کچھ مانگ لے الفت سے مری جانِ حزیں اور

زلفوں کو ذرا اور بھی آنکھوں پہ جھکا دو
میخانے سے بادل کو کرو کچھ تو قریں اور

الطاف مجھے جس نے دیا دردِ محبت
اس آنکھ میں کیا ایسی کوئی چیز نہیں اور

غزل

غم سے معمور ہواؤں سے لپٹ کر رو لوں
ان المناک فضاؤں سے لپٹ کر رو لوں
کون بازار میں اس جنس کا گاہک ہوگا؟
آپ ہی اپنی وفاؤں سے لپٹ کر رو لوں
پھر خدا جانے کہاں کیسی بہاریں گزریں
باغ کی مست ہواؤں سے لپٹ کر رو لوں
جامِ مے، ابر، گلستاں، مگر آغوش تہی
جی میں آتا ہے گھٹاؤں سے لپٹ کر رو لوں
جن کی دنیا میں مہ و مہر نہیں ہوتے طلوع
ایسے بیمار خداؤں سے لپٹ کر رو لوں
ان کے دامن پہ نہیں حرص و ہوا کے دھبّے
تیرے کوچے کے گداؤں سے لپٹ کر رو لوں
رات کے بعد سحر ہوتی ہے الطاف اگر
کیوں نہ میں ان کی جفاؤں سے لپٹ کر رو لوں

غزل

یہ بھری بزم یہ احباب کہاں پھر ہونگے
دل کے بہلانے کے اسباب کہاں پھر ہونگے

نکہت و نور میں ڈوبی ہوئی راتوا افسوس
یہ فسوں کار و حسیں خواب کہاں پھر ہونگے

تیرہ بختی مجھے آغوش میں لے گی بڑھ کر
جلوہ ہائے رخِ مہتاب کہاں پھر ہونگے

میں پڑا ہوں گا کہیں دور بیابانوں میں
میرے ساتھی میرے احباب کہاں پھر ہونگے

ایک برباد جوانی پہ جو روئے برسوں
آہ وہ دیدۂ پُر آب کہاں پھر ہونگے

موت کے سرد دھندلکوں میں اُتر جاؤں گا
زندگانی کے یہ اسباب کہاں پھر ہونگے

اب مری یاد میں الطاف جو خوں روتے ہیں
مجھ سے ملنے کو وہ بے تاب کہاں پھر ہونگے

غزل

کون رنگیں پیرہن شرما گیا
غنچہ و گل کو پسینہ آ گیا

مسکرائے وہ کچھ اِس انداز سے
طُور ہونٹوں پر سمٹ کر آ گیا

آئینہ سے ان کی آنکھیں کیا لڑیں
حادثے سے حادثہ ٹکرا گیا

مست آنکھوں کا ترنّم الاماں
میکدے کو گنگنانا آ گیا

ایک نغمہ، اک ترنّم ایک لے
ذہن پر کس کا سراپا چھا گیا

دو نگاہیں ملتے ملتے رہ گئیں
شعر ناکامی کی زد میں آ گیا

آنسوؤں کو مسکراتے دیکھ کر
آسماں تاروں کا دھوکا کھا گیا

چھوڑیئے الطاف اب تو میکشی
نوجوانی پر بڑھاپا چھا گیا

غزل

آہ دنیا سرائے فانی ہے
کس قدر مختصر کہانی ہے

خود کو دیتا ہوں مسکرا کے فریب
دل مگر وقفِ نوحہ خوانی ہے

مجھ سے ہنس بول لیں مرے ساتھی
اب کوئی دن کی زندگانی ہے

موسمِ گل میں وہ جو آن ملیں
ہم بھی جانیں کہ رُت سہانی ہے

بے سبب تو نہیں بہے آنسو[1]
آنسو آنسو میں اک کہانی ہے

اک سراپائے رنج و یاس ہیں ہم
دردِ دل مونسِ جوانی ہے

مسکراؤں میں کس طرح الطاف
تاک میں دورِ آسمانی ہے

[1] اس شعر سے میرے عزیز ترین دوست آغا عبدالعلی (ابنِ آصف) کی ایک دلخراش یاد وابستہ ہے۔ الطاف

غزل

معنبر معنبر گلستاں گلستاں
یہ کون آ رہا ہے خراماں خراماں
نشیلے لبوں میں گلابوں کی سُرخی
نظر سے شرابیں نمایاں نمایاں
دھڑکتے ہوئے خواب پلکوں کی زد میں
مہکتا تنفس گل افشاں گل افشاں
لبوں کے کنارے حسیں عارضوں میں
شفق پھر رہی ہے خراماں خراماں
مصوّر کی تخئیل انگڑائیوں میں!
جوانی رگوں میں غزلخواں غزلخواں
بسی ہے نگاہوں میں کس کی ملاحت
کہ زخم جگر ہیں نمکداں نمکداں
ہے اک شعر الطاف اُن کا سراپا
تڑپتا ہے ہر اک سخنداں سخنداں

غزل

بحرِ ہستی کوئی سراب نہیں
زندگی زندگی ہے خواب نہیں

آہ انسان جس کی آنکھوں پر
اپنا انجام بے نقاب نہیں

ایک خورشید رخ کی زلفوں کا
رات کے پاس کچھ جواب نہیں

زندگی درد سے ہوئی محروم
میکدہ ہے مگر شراب نہیں

مطربِ وقت! تیرے ہاتھوں میں
کیوں ہے تلوار، اور رباب نہیں

آدمی آدمی کا رازق ہے
نظمِ عالم مگر خراب نہیں

ہائے الطاف وہ حزیں راتیں
جن کی قسمت میں ماہتاب نہیں

غزل

خوش رنگ و سحر کار نظاروں کو کیا ہوا
اللہ! اس چمن کی بہاروں کو کیا ہوا
روشن تھیں جن سے بزم تصور کی خلوتیں
ان رشکِ مہر و ماہ ستاروں کو کیا ہوا
ساحل کو پا سکی نہ کبھی کشتئ حیات
دریائے آرزو کے کناروں کو کیا ہوا
اپنے پرائے ہو گئے قسمت کے ساتھ ساتھ
مجبور زندگی کے سہاروں کو کیا ہوا
نغمہ بلب ہوں اور نہ نالہ بلب ہوں میں
سازِ جنون و عشق کے تاروں کو کیا ہوا
لبہائے لالہ گوں ہیں اور اک تلخیٔ عتاب
میٹھے تبسموں کی پھواروں کو کیا ہوا
مدت سے گلستاں ہے برنگِ رخِ مریض
الطاف سرخ سرخ بہاروں کو کیا ہوا

غزل

نگاہوں نے پلکوں کے گھونگھٹ اُٹھائے
شرابیں ہنسیں میکدے گنگنائے

ادھر بھی کرم ہو خراماں خراماں
پڑا ہوں سرِ راہ سجدے بچھائے

بہار آئے جیسے چمن میں اچانک
تصور میں میرے وہ یوں مسکرائے

مغنّی! کوئی ایک نغمہ، کہ جس سے
جوانی محبت کا غم بھول جائے

بہے میری آنکھوں سے جب اشکِ سیمیں
ستارے سمجھ کر فلک نے چرائے

وہ طوفان، وہ زندگی کا تلاطم
یہ ساحل جہاں موت آنکھیں دکھائے

تصوّر میں آیا وہ جانِ گلستاں
نظر کو بہاروں کا مسکن بنائے

کسی کی نگاہوں میں الطاف چپ ہیں
شرابوں کے نشّے گلابوں کے سائے

غزل

دل کو ہے عشق کا آزار چلا جاؤں گا
تیری بستی سے ہیں بیمار چلا جاؤں گا
چھن گئی جن سے ترے سایوں کی ٹھنڈی چھاؤں
دور ان گلیوں سے ناچار چلا جاؤں گا
جس کا حاصل ہے فقط چند گھٹی سی سانسیں
ایسے جینے سے ہوں بیزار چلا جاؤں گا
پڑھ کے ماتھے پہ ترے آگ اگلتی شکنیں
وادیٔ زیست کے اس پار چلا جاؤں گا
اونگھنے والی نگاہوں سے چرایا تھا جنھیں
ہو کر ان خوابوں سے بیدار چلا جاؤں گا
حوصلے آہ بلب اور ارادے بیمار
اب مرا کون ہے غمخوار چلا جاؤں گا
نطق پر پہرے ہیں الطاف لبوں پر تالے
جب ستم ہے درپئے آزار چلا جاؤں گا

غزل

ذکر ہے جس میں جوانی کے اُجڑ جانے کا
کتنا دلکش ہے وہ حصّہ مرے افسانے کا

دم بخود ناگنیں، شرمندہ گھٹا، رات خجل
ہائے عالم تری زلفوں کے بکھر جانے کا

لے کے آغوش میں اک یاد کی کچھ تصویریں
بھیس بدلا ہے مرے دل نے صنم خانے کا

خواب آلود فضاؤں میں نظر کرنے والو!
ہم نے دیکھا ہے سماں پھول کے مرجھانے کا

تھام لے موت کا دامن کہ رہِ مقصد سے
زندگی مشورہ دیتی ہے بھٹک جانے کا

نور افروز ہُوا شمعِ محبّت بن کر
محفلِ عشق میں آنسو ترے دیوانے کا

پھیر لیں وقت پہ اپنوں نے نگاہیں الطاف
کس زباں سے کروں شکوہ کسی بیگانے کا

غزل

یہ آنکھوں ہی آنکھوں میں کیا ہو گئے ہم
ابھی جاگتے تھے ابھی سو گئے ہم

مقامِ تجسس اک ایسا بھی آیا
کہ پایا تجھے اور خود کھو گئے ہم

ترے غم کو خود سے بھی ہم نے چھپایا
مگر پھر بھی رسوائے غم ہو گئے ہم

جو اب تک تھے زیبِ قبائے محبت
کچھ ایسے بھی موتی کبھی رو گئے ہم

عناصر نے لیں ہچکیاں سانس اکھڑی
کہا عشق نے جاوداں ہو گئے ہم

یہ معراجِ دردِ محبت ہے شاید
کہ تیری نظر میں بھی غم ہو گئے ہم

تڑپنے میں الطاف وہ لذتیں تھیں
کہ تڑپے نہ جی بھر کے اور سو گئے ہم

غزل

کس کا حاصل مجھے سہارا ہے
تلخیٔ زیست بھی گوارا ہے

میری کشتی کو فکرِ ساحل کیا
موجِ طوفاں بھی اک کنارا ہے

چند تبدیلیوں کے پیشِ نظر
میں نے تقدیر کو پکارا ہے

میرے ماضی کے آسمانوں پر
کوئی کوئی کہیں ستارا ہے

کھا رہا ہوں فریب اور مجھ پر
فطرتِ حُسن آشکارا ہے

آہ ایسا کوئی نہیں جس کو
ہم بھی سمجھیں کہ وہ ہمارا ہے

مجھ سے الطاف کہہ رہے ہیں وہ
آپ کا نام کتنا پیارا ہے

غزل

تصور میں پھر ان کو لانا پڑا
محبت کو مرکز پر آنا پڑا

محبت میں مجھ پر یہ کیا وقت ہے
کہ روتے ہوئے مسکرانا پڑا

زباں سے بہت گیت گائے مگر
نظر سے بھی اک گیت گانا پڑا

یہ آئینِ بزمِ خرابات ہے
کہ دانستہ بھی لڑکھڑانا پڑا

غمِ زندگی اُف غمِ زندگی
محبت کا غم بھول جانا پڑا

سہاروں کے باوصف کیا ظلم ہے
مری ناؤ کو ڈوب جانا پڑا

یہ ماحول الطاف اور زندگی
مگر زندگی سے نبھانا پڑا

غزل

زندگی درد سے قریب رہے
غم کی دولت مجھے نصیب رہے
موسم ایسا بھی ہو کوئی صیّاد!
باغ جب وقفِ عندلیب رہے
مسکرادو کسی کی میّت پر
موت کیوں تیرہ و مہیب رہے
وصل کو وصل جاننے کے لئے
زینتِ بزم اک رقیب رہے
جان کا کھیل کھیلنے والو!
امتحاں کو درِ حبیب رہے
جاگ کر میں نے کاٹ دیں راتیں
نیند میں گم مگر نصیب رہے
کس نے الطاف دی دعا مجھ کو
درد سے زندگی قریب رہے

غزل

یہ کس نے نظر کی زباں سے پکارا
کہ آنکھیں بدلنے لگا ہر سہارا
مری ناؤ کا ناخدا خود خدا تھا
کہ طوفان بنتے رہے ہیں کنارا
ہوئیں بند آنکھیں کھلا بابِ منزل
یہ حسنِ نظر ہے یہ ذوقِ نظارا
کبھی پھر نظر آئے وہ خوابِ شیریں
جگایا تھا جس نے مقدر ہمارا
یہ مانا کہ نظریں تری ملتفت ہیں
مگر مجھ کو غم جان سے بھی ہے پیارا
یہ کیا وقت ہے ان کی آنکھوں پہ یارب
یہ کیوں ٹوٹ کر بہہ رہا ہے ستارا
محبت میں الطاف میں کھو گیا تھا
غمِ زندگی نے بالآخر پکارا

غزل

نشیلے لبوں میں ہنسی جگمگائی
فلک پر ستاروں نے گردن جھکائی

یہ کن مست آنکھوں سے خوابوں نے جھانکا
یہ کیوں بے ارادہ مجھے نیند آئی

برسنے کے وعدے پہ رندوں سے اکثر
قسم تیری زلفوں کی بادل نے کھائی

ہنسی سرخ ہونٹوں کی نظریں بچا کر
شعاعیں مہ و مہر سے چھین لائی

سلامت غرورِ قناعت سلامت
خدائی پہ خنداں ہے میری گدائی

گئے وقت کی یاد نے جب ستایا
کوئی چیز سینے سے ہونٹوں کو آئی

نتیجہ ہے احباب کی بے رخی کا
کہ غربت میں الطاف کو موت آئی

غزل

نزاکت محبّت کا غم کھا رہی ہے
محبّت محبت ہوئی جا رہی ہے

تمہاری نظر کے حسیں میکدوں میں
عروسِ خرابات اٹھلا رہی ہے

نظر کیا لڑی ایک خنداں نظر سے
جوانی تبسّم بنی جا رہی ہے

تصوّر کے ہاتھوں میں دے کر کھلونے
جوانی محبت کو بہلا رہی ہے

یہ کیا بات ہے اجنبی انکھڑیوں سے
کوئی جانی بُوجھی صدا آ رہی ہے

نہ پھولوں کی رُت ہے نہ کلیوں کا موسم
مگر بلبلِ بے نوا گا رہی ہے

یہ الطاف کون آ گیا وقتِ آخر
قضا نرم و شیریں ہوئی جا رہی ہے

غزل

جہاں مستور وہ پردہ نشیں ہے
نظر والوں سے پوشیدہ نہیں ہے

تہہِ گردوں کئی موسےٰ ہیں لیکن
حریمِ طور میں جلوہ نہیں ہے

ہٹا لو آستاں راہوں سے میری
ابھی ناواقفِ سجدہ جبیں ہے

یہ سانسیں اور یہ سانسوں کے ٹکڑے
ابھی سب کچھ تھا، اب کچھ بھی نہیں ہے

مری خاموشیاں عینِ تکلّم
تبسّم سے مرا گریہ حسیں ہے

بجز غم کون ہے الطاف اپنا
میں سب کا ہوں کوئی میرا نہیں ہے

غزل

دل کو دوائے درد بتا کر چلے گئے
احسان کرنے آئے تھے آکر چلے گئے

پردہ پڑا ہوا تھا اُٹھا کر چلے گئے
فرقِ حیات و مرگ بتا کر چلے گئے

پاتے ہی چشمِ مست کو مائل بہ التفات
ہم میکدے سے آنکھ بچا کر چلے گئے

تاریکیٔ حیات سے یوں بدگماں ہوئے
ہر دل میں اک چراغ جلا کر چلے گئے

تخئیل کے افق پہ وہ جب بھی ہوئے طلوع
یادوں کا اک دیار بسا کر چلے گئے

دنیائے درد و غم میں ہیں ایسے بھی اہلِ غم
غم سے جو غم کا راز چھپا کر چلے گئے

لے کر تری نظر کا سہارا ترے مریض
بارِ غمِ حیات اُٹھا کر چلے گئے

غزل

بشر کو فسونِ نظر دے رہا ہوں
شبِ بے سحر کو سحر دے رہا ہوں
خبر دو ترستے ہوئے دامنوں کو
میں آنسو بشکلِ گہُر دے رہا ہوں
ستارے بغلگیر ہوں آنسوؤں سے
فغاں کو اک ایسا اثر دے رہا ہوں
تری یاد کو بہرِ جلوہ فروشی
تصوّر کے دیوار و در دے رہا ہوں
ازل سے فرشتوں کو حسرت ہے جس کی
بشر کو وہ دردِ جگر دے رہا ہوں
ہٹا لو جبیں سے گھنے گیسوؤں کو
میں شب کو نویدِ سحر دے رہا ہوں
یہ الطاف ہے میرا ایثارِ رنگیں
کہ شاخِ ادب کو ثمر دے رہا ہوں

غزل

خلش کا زیست کو انعام دینا
کہیں سے گردشِ ایّام دینا

محبت کو ہوس کا نام دینا
جوانی پر کوئی الزام دینا

بڑھا کر ہاتھ ماضی کے افق سے
کوئی گاتی ہوئی اک شام دینا

نظر کے میکدوں سے مسکرا کر
کوئی شئے دافعِ آلام دینا

دلِ پُر داغ! داغوں کا تصدّق
مجھے بھی اک چراغِ شام دینا

میں جب تک محوِ حسن و مے ہوں ساقی
قضا کے ہاتھ میں بھی جام دینا

مئے باقی پلا کر مجھ کو الطاف
قضا کو موت کا پیغام دینا

غزل

خزاں سے مانوس ہو چکے ہیں نہیں خبر کچھ بہار کیا ہے
تڑپ کی لذّت ہے جن کو حاصل نظر میں ان کی قرار کیا ہے

بچے گا کب تک غریب انساں حوادث و گردشِ زماں سے
ہوا کے جھونکوں میں جل سکے گا چراغ یہ اعتبار کیا ہے

قریب ہو کر بھی دور ہیں جیسے ایک دریا کے دو کنارے
یونہی گلستاں میں رہ کے بھی ہم نہیں ہیں واقف بہار کیا ہے

چمن کے ہو کر جو جی رہے ہیں خزاں ہے رشکِ بہار اُن کی
پرستشِ گلستاں ہی ٹھہری تو فرقِ غنچہ و خار کیا ہے

نشاطِ وصل و شرابِ دیدار پر جو کم ظرف مطمئن ہیں
اُنہیں کوئی کس طرح بتائے تعیّشِ انتظار کیا ہے

خدارا الطاف مجھ سے احباب میری تنہائیاں نہ چھینیں
غموں کے ہوتے ہوئے کسی کو ضرورتِ غمگسار کیا ہے

غزل

خرد کے ذہن میں دیوانگی نے کروٹ لی
قضا کی گود میں یا زندگی نے کروٹ لی
شبِ حیات میں پیمانہ جب طلوع ہُوا
غموں کی تیرگی میں چاندنی نے کروٹ لی
حسین قہقہہ ٹوٹا لبِ شفق زا سے
فضا کے دوش پہ یا پھلجھڑی نے کروٹ لی
جھکی جھکی ہوئی نظروں میں گیت چونک اُٹھے
کہ میکدوں میں جواں شاعری نے کروٹ لی
وطن کی یاد کے آتے ہی یوں بہے آنسو
فلک کی آنکھ میں جیسے جھڑی نے کروٹ لی
کسی کے ہونٹ تبسّم سے ہمکنار ہوئے
شفق کی گود میں یا چاندنی نے کروٹ لی
وہ میرے پاس ہیں الطاف اور میں غمگیں
خوشی کے ساتھ یہ کیوں بیکلی نے کروٹ لی

غزل

مضطرب میرے لئے اک نازنیں ہے آجکل
میرے قدموں پر ستاروں کی جبیں ہے آجکل

جلوہ گاہِ طور شرمانے پہ کیوں مجبور ہے
کس کا پر تو میری آنکھوں میں مکیں ہے آجکل

انہی آنکھوں سے خدارا اِک نگاہِ التفات
آہ کوئی میکدہ بس میں نہیں ہے آجکل

دیکھنے کو مل رہا ہے ایک جانِ شاعری
میری دنیائے نظر کتنی حسیں ہے آجکل

چند آنسو، چند آہیں اور اک خوابِ طویل
تھا ازل میں جس جگہ انساں وہیں ہے آجکل

چھن چکیں الطاف مجھ سے صحبتیں احباب کی
آہ دُنیا میں کوئی میرا نہیں ہے آجکل

غزل

محبت محبت، جوانی جوانی
دلوں کا فسانہ، نظر کی کہانی
نگاہوں کو دو اذنِ افسانہ گوئی
مرتّب کرو کوئی رنگیں کہانی
یہ آنسو ہیں تم کھیل سکتے ہو ان سے
ستارے نہ سمجھو انہیں آسمانی
غموں کے سہارے جئے جا رہا ہوں
ترا درد ہے حاصلِ زندگانی
حسیں فرصتیں ہوں میسّر تو سُن لو
نظر میں لئے پھر رہا ہوں کہانی
تصوّر سے مانگی ہے الطاف میں نے
بہاروں میں ڈوبی ہوئی اک جوانی

غزل

نظر نے نظر سے کہے کچھ فسانے
مرتّب ہوئے چند رنگیں ترانے

مقامِ پرستش اِک آئے گا ایسا
جبیں کو ترس جائیں گے آستانے

یہ توہینِ پرواز ہے ہم صفیرو!
نظر میں بسے ہوں اگر آشیانے

مجھے موت نے خودکشی سے بچایا
مری آبرو رکھ لی میرے خدا نے

خزاں ہی میں برباد کر لوں جوانی
بہار آئے گی یا نہیں کون جانے

مرے ڈوبنے کا سبب بس یہی ہے
سہارا دیا تھا مجھے ناخدا نے

یہ توہینِ غم کون الطاف دیکھے
کہ سر پر کھڑے ہیں خوشی کے زمانے

غزل

ہو گئی عشق میں بدنام جوانی اپنی
بن گئی مرکزِ آلام جوانی اپنی

ماضی و حال ہیں محرومِ شراب و نغمہ
ہائے افسردہ و ناکام جوانی اپنی

آہ وہ صُبح جو تھی صُبحِ بہارِ ہستی
ہے اُسی صبح کی اب شامِ جوانی اپنی

ایک تاریک فضا ایک گھُٹا سا ماحول
کسی مفلس کا ہے انجام جوانی اپنی

انہیں راہوں میں انہیں مست و جواں گلیوں میں
لڑکھڑائی ہے بہر گام جوانی اپنی

ایک وہ دن تھا کہ میخانوں پہ ہم بھاری تھے
آج ہے دُردِ تہہِ جام جوانی اپنی

اکتفا کر کے کھنکتے ہوئے روز و شب پر
بن گئی زیست پہ الزام جوانی اپنی

دن ہُوا، دُھوپ چڑھی، ڈھل گئے سائے الطاف
اب ہے اِک بجھتی ہوئی شامِ جوانی اپنی

داغ بیل

اے اہلِ بزم اور بھی ہاں اور بھی شراب
بس ایک گونج باقی ہے تارِ رباب میں

رباب

داغ بیل

اے وارثِ کونین ذرا دھوم مچا کے
دیوانہ کوئی پوچھے اگر جوش میں آ کے
کہہ دے یہ چھلکتا ہوا اک جام چڑھا کے
پتہ بھی نہیں ہلتا بغیر اُس کی رضا کے

وہ دیکھ غمِ زیست نے اشکوں کو پکارا
بیباک امنگوں کو وہ نیند آئی کہ آئے
آلام نے ہنسوں کو جوانی میں بکھیرا
حسرت سی تمناؤں کے چہرے سے عیاں ہے

جذبات کو دے ساغر و مینا کا سہارا
کر جھوم کے میخانے کی وسعت پہ خدائی
کر ساقیٔ کمسن کی نگاہوں میں بسیرا
اے رندِ بلا نوش! ترا جام کہاں ہے

پی زاہدِ کم ظرف کو پہلو میں بٹھا کے
دیوانہ کوئی پوچھے اگر جوش میں آ کے
کہہ دے یہ چھلکتا ہوا اک جام چڑھا کے
پتہ بھی نہیں ہلتا بغیر اُس کی رضا کے

ترانۂ مستی

اے رندِ خرابات چھلک جائے گلابی
نظّارے ہوں مدہوش تو فطرت ہو شرابی

یوں جام اُٹھا جھوم کے رہ جائے زمانہ
میخانے کا در جھوم کے رہ جائے زمانہ

ایمان کے اوسان پہ لہرائیں شرابیں
زاہد کے بڑھاپے پہ بھی چھا جائیں شرابیں

قُل قُل کے ترنّم میں جوانی کو ڈبو لے
نیکی کا کوئی داغ ہے گر دِل پہ تو دھو لے

پیمانہ لگا ہونٹوں سے واعظ کو دکھا کے
دیوانہ کوئی پوچھے اگر جوش میں آ کے
کہدے یہ چھلکتا ہُوا اک جام چڑھا کے
پتّہ بھی نہیں ہلتا بغیر اس کی رضا کے

میخوار تجھے جام و صراحی کی قسم ہے
ساقی کی جنوں خیز جماہی کی قسم ہے

فردوسِ خرابات کے دستور کی سوگند
دوشیزگئ دُخترِ انگور کی سوگند

سوگند گناہوں کی جو ایمان ہیں تیرا
مستانہ نگاہوں کی جو ایمان ہیں تیرا

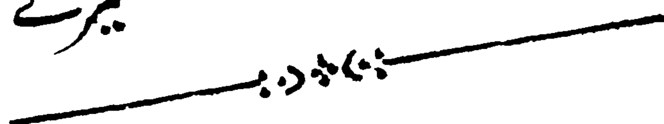
کلیوں کے پسینے کی قسم جھوم کے کر رقص
ساون کے مہینے کی قسم جھوم کے کر رقص

داغ بیل

اک لغزشِ حسین کے لئے دل ہے بے قرار
ساغر میں آج بھر کے پلا دے مئے وصال
میرے پری جمال

آنکھوں میں آنکھیں ڈال کے مدہوشیاں بکھیر
جذبات ہوں جوان وہ سرگوشیاں بکھیر
گاتی۔ بہکتی۔ جھومتی بے ہوشیاں بکھیر
رہ جائے مجھ سے پیچھے کہیں حدِ اعتدال
میرے پری جمال

میخانے کھیلتے ہیں تری انکھڑیوں کے پاس
مجھ کو یہ سہمی سمٹی جوانی نہیں ہے راس
الطاف تیرا ہو کے رہے اس طرح اداس
اک جامِ آتشیں کہ طبیعت ہے پُرملال
میرے پری جمال



ساقی اور میں

ساقی مرے حسین و جواں ساقیا ادھر
گاتی ہوئی نگاہ بہکتی ہوئی نظر
ساغر اُٹھا کہ موسمِ گل ہے شباب پر
مستانہ انکھڑیوں کی جوانی بھی اس میں ڈال
میرے پری جمال

یہ نرم بازوؤں کی بناوٹ یہ دل کشی
ہاتھوں میں چوڑیوں کی سجاوٹ یہ دل کشی
پلکوں کی مست مست تھکاوٹ یہ دل کشی
اس ساعتِ جواں میں نہ رندوں کو کل پہ ٹال
میرے پری جمال

ساون ہے، تو ہے، میں ہوں، جوانی پہ ہے نکھار
شیشے میں ہنس رہی ہے کوئی دخترِ بہار

آہ شاید تو رموزِ زیست سے واقف نہیں
نیند میں کھوئے ہوئے ہیں تیرے جذباتِ حسیں
اس خراب آباد میں کچھ روز جینے کے لئے
دوست! ہر خود دار ہے مجبور پینے کے لئے
جب کڑکتی ہیں فضا میں بجلیاں آلام کی
دیکھنا پڑتی ہے صورت بادۂ گلفام کی
جب مصائب چوسنے لگتے ہیں انساں کا لہو
دوڑتے ہیں پرسشِ احوال کو جام و سبو
قیصریت کھیلنے لگتی ہے جب جذبات سے
دخترِ رز روک دیتی ہے گلابی ہات سے
گھر کے چھا جاتا ہے جب بادل غم و افکار کا
کام دیتی ہے شراب ارغواں غم خوار کا
زندگی سے جب بشر مایوس آتا ہے نظر
چھیڑتی ہے مے شرابی راگ دل کے ساز پر
الغرض اے دوست لازم ہے یہ جینے کیلئے
خم کے خم چاروں طرف رکھے ہوں پینے کیلئے

——————:o:✡:o:——————

منظور کے نام

آہ اے منظور میرے دوست کیا کرتا ہے تو
لوگ آوارہ مجھے کہتے ہیں اور ڈرتا ہے تو!

بادۂ گلگوں سے میں کرتا ہوں تجدید حیات
اور بسر کرتا ہے بے چینی سے تو بستر پہ رات

جھومتا ہوں میں نظر پڑتی ہے جس دم جام پر
تو لہو روتا ہے راتوں کو مرے انجام پر

جب ترے آگے مجھے کہتے ہیں رسوائے شباب
کس لئے لیتا ہے کروٹ تیری آنکھوں میں حجاب

میں جوانی کو جلا دیتا ہوں بہتی آگ سے
کس لئے سینے پہ تیرے لوٹتے ہیں ناگ سے

جب کسی ساقی کے پہلو میں مجھے پاتا ہے تو
دوست! آخر کس لئے کچھ سہم سا جاتا ہے تو

جب مری گردن میں ہوتے ہیں حسیں باہوں کے ہار
کیوں نہیں تھمتی تری آنکھوں سے اشکوں کی پھوار

دوست! میرے دل کے کاشانے کے دیرینہ مکیں
سوچتا ہوں کیوں مری راحت تجھے بھاتی نہیں

توبہ

اگر شراب کو چھوڑوں بھی آج سے ناصح!
چراغِ حُسن کی لَو پر مجھے جَلا دینا
کسی نگاہ سے کچھ بجلیاں گرا دینا
کسی حسین کے جادو فروش زانو پر
تھپک کے نیند قضا کی مجھے سُلا دینا
گریں جو ساقیٔ مہوش کے نرم ہونٹوں سے
اُنہیں حسین گلوں میں مجھے دبا دینا
تمرّد تم آتشِ رخسارِ سُرخ میں جل کر
کروں جو بادہ کشی تو یہ بد دعا دینا
مرے نصیب کی مشعل ہو گر کبھی روشن
تو آبِ خوشۂ انگور سے بجھا دینا
نظر کی، دل کی، جبیں کی، جگر کی، ہونٹوں کی
غرض جو جی میں ترے آئے وہ سزا دینا
اگر شراب کو چھوڑوں بھی آج سے ناصح!

عروسِ عظمتِ شیطاں کے رخ کی رنگینی
غرور، سرکشی، الحاد، کفر، بے دینی
جنابِ شیخ کو ساقی بنا کے پیتا جا
غمِ حیات کو آنکھیں دکھا کے پیتا جا

کوئی کہے اگر آوارۂ شباب تجھے
بتائے روئے حقیقت کی گر نقاب تجھے
دکھائے آنکھ سے بھی قبر کا عذاب تجھے
جواب میں تو فقط مسکرا کے پیتا جا
غمِ حیات کو آنکھیں دکھا کے پیتا جا

وہ گنگناتی ہوئی آگ جس کے قدموں پر
شباب سر کو جھکائے ہوئے ہے شام و سحر
جلو میں ہمتِ عالی کی بجلیاں لے کر
تو ایسی آگ کو امرت بنا کے پیتا جا
غمِ حیات کو آنکھیں دکھا کے پیتا جا

ترا شباب جو آلودۂ شراب نہیں
نظر میں کیف نہیں، ہات میں رباب نہیں
فضا میں زلف کا چھایا ہوا سحاب نہیں
تو تیری زیست پہ اک مردنی سی طاری ہے
ترے شباب کی آنکھوں سے خون جاری ہے

داغ بیل

پیتا جا

رموزِ زیست سے پردہ اُٹھا کے پیتا جا
شراب و شعر کی وسعت پہ چھا کے پیتا جا
غرورِ زہد کو نیچا دکھا کے پیتا جا
متاعِ عہدِ جوانی لٹا کے پیتا جا
غمِ حیات کو آنکھیں دکھا کے پیتا جا

تجھے نگاہ کے چھلکے ہوئے سبو کی قسم
شراب خانے کی چوکھٹ کی آبرو کی قسم
عروقِ خوشۂ انگور کے لہُو کی قسم
جحیم و خلد کا خدشہ مٹا کے پیتا جا
غمِ حیات کو آنکھیں دکھا کے پیتا جا

وفورِ عیش و مسرت سے لڑکھڑاتے ہوئے
تفکراتِ زمانہ پہ مسکراتے ہوئے
قیودِ مذہب و ملت کا دل دکھاتے ہوئے
قدم قدم پہ بہاریں لٹا کے پیتا جا
غمِ حیات کو آنکھیں دکھا کے پیتا جا

ملا کے ساغرِ مے میں گنہ کی شیرینی

ناکام خدائی

یہ مانا میں نے کہ تیرا کوئی جواب نہیں
نگار خانۂ ہستی بھی کچھ خراب نہیں

گلوں کے پاک تبسم میں مستیاں بھی ہیں
فضا میں نرم ترنم کی بستیاں بھی ہیں

شباب و شعر میں رکھتی ہے زندگی کی اساس
مزا زباں کا بدلنے کو ہے لبوں کی مٹھاس

چمن میں مست عنادل بھی ہیں چہکنے کو
نوا میں جام جوانی بھی ہیں بہکنے کو

روش روش پہ بہاروں کی ہے فراوانی
کلی کلی میں خماروں کی ہے فراوانی

قدم قدم پہ نگاہوں کی پیاس بجھتی ہے
حسین جلووں سے راہوں کی پیاس بجھتی ہے

ترے جہاں میں محبت بھی ہے شباب بھی ہے
شعاعِ ماہ کا گاتا ہوا رباب بھی ہے

مگر خدائی تری کامیاب بن نہ سکی
کہ ایک بوند بھی تجھ سے شراب بن نہ سکی

اس خراب آباد میں کچھ روز جینے کیلئے
دوست اپنے خود دار ہیں مجبور پینے کیلئے

الطاف

شراب

داغ بیلی

پیشگوئی

بجلیاں اور بھی کچھ سینۂ افلاک میں ہیں
انقلابات ابھی اور بھی کچھ تاک میں ہیں

وقت چھیڑے گا تباہی کے ترانے کچھ اور
کھیت اگلیں گے بغاوت کے خزانے کچھ اور

آگ افکار کی الفاظ میں ڈھل جائے گی
تیرگی خام اجالوں کو نگل جائے گی

زندگی مانگ میں بھر لے گی لہو کا سیندور
وقت تخریب کی تکمیل پہ ہوگا مجبور

نغمہ و ساز میں طوفان کی خو آئے گی
تند الفاظ سے بارود کی بو آئے گی

طاغیتیں سرکش و بیباک زمانہ چپ چپ
جھومتے جاگتے کردار فسانہ چپ چپ

چشمِ نمناک میں سورج کا بسیرا ہوگا
خشک ہونٹوں پہ تبسم کا سویرا ہوگا

راگ کی آگ میں ماحول پگھل جائے گا
گیت کی لے سے نیا عہد ابھر آئے گا

ماغ بل

بیمارِ محبت

اے سوختہ جاں آہ ترا عہدِ جوانی
دل وقفِ الم آنکھ سے اشکوں کی روانی

کیا بات ہے کس واسطے یہ حال ہے تیرا
کیوں بھیگا ہوا ریشمیں رومال ہے تیرا

کیوں تیری نگاہوں سے برستے ہیں فسانے
اُف ہونٹوں پہ آنے کو ترستے ہیں فسانے

کیوں تیری طرف کس لئے دیکھا نہیں جاتا
ہونٹوں کو ترے میں کبھی خنداں نہیں پاتا

سوز کے آغوش میں سویا سا ترنم
یہ کیوں چھینتا ہے میرے لبوں سے بھی تبسم

حیراں ہوں کہ تو رات کو کیوں سو نہیں سکتا
کیوں داغ ترے دل کا کوئی دھو نہیں سکتا

کیا بات ستاروں سے تو کرتا ہے شبوں کو
ہر آن یہ کیا آہ سی بھرتا ہے شبوں کو

کس چیز کو کرتا ہے گلستاں میں اشارہ
ہاں گل نہ بتا دے تجھے پھولوں کا نظارہ

اے سوختہ جاں آہ ترا عہدِ جوانی
دل وقفِ الم آنکھ سے اشکوں کی روانی

واصح بیل

آنکھ پُرنم اور دل میں آتشِ بے دُود ہے
دوست جانے دے مجھے اب روکنا بے سُود ہے

چرواہی

اے جوانی کے حسیں خوابوں کی متوالی بہار
چھوڑ دے بھیڑیں مرے کھیتوں میں اور گیسو سنوار
آہ کانٹے چُبھ رہے ہیں تیرے نازک پاؤں میں
بیٹھ جا کچھ دیر اس شیشم کی ٹھنڈی چھاؤں میں
جم رہی ہیں پپڑیاں ہونٹوں پہ تیرے پیاس سے
وہ اُٹھا لا چھاچھ کا برتن لپک کر گھاس سے
کھینچ کر آنچل ذرا سینے کو اپنے ڈھانپ لے
راز تیری نوجوانی کا نہ کوئی بھانپ لے
کوئی بانکا نوجواں کر دے نہ تجھ کو بے قرار
زندگی تیری نہ ہو جائے الم سے ہمکنار
تیری آنکھوں میں نہ آنسو مُسکرانا سیکھ جائیں
رس بھرے ہونٹوں پہ آہیں گنگنانا سیکھ جائیں
دل کی خواہش ہے کہ کھیتوں پر تری شاہی رہے
جب تلک زندہ ہے تُو اک مست چرواہی رہے

گاؤں کو جاتے ہوئے

سلام اے ہمنشیں اب گاؤں کو جاتا ہوں میں
شہر کے آباد ویرانے سے گھبراتا ہوں میں

رو رہی ہو گی کوئی معصوم میری یاد میں
ہو رہی ہو گی فضا مغموم میری یاد میں

لوگ دل میں سوچتے ہوں گے کہ یہ زہرہ جبیں
کچھ دنوں سے کیا خبر ہے کس لئے اندوہگیں

اُس کی ماں نے یوں کہا ہوگا کہ یہ بیمار ہے
دل کی دھڑکن کا اسے کچھ روز سے آزار ہے

لُوٹنے کے واسطے پھولوں سے قدموں کا شباب
کھیت کی مغموم راہیں ہونگی وقفِ اضطراب

چومنے کو مدھ بھری آنکھوں کے جامِ پُرخمار
ہو رہے ہوں گے چراگاہوں کے منظر بے قرار

لے کے ہونٹوں میں مری شیریں ادا کے نام کو
شبنمیں آنسو بہاتی ہوں گی کرنیں شام کو

چوسنے کے واسطے لچکیلی تانوں کی مٹھاس
ہو رہے ہوں گے در و دیوار غمگیں اور اُداس

ہمنشیں پہنچوں گا جونہی سادہ گلیوں کے قریب
پھول کی مانند کِھل جائیگی میری غم نصیب

ایک بیتی ہوئی رات

اے سکھی وہ رات آئے گی کبھی پھر لوٹ کر
جب سہانی بیریوں میں گاؤں کے نالے سے پار
ہو رہے تھے مجھ ابھاگن کے لئے وہ بے قرار
جب بہانہ کھیلنے کا میں بنا کر آئی تھی
تھپکیوں سے ننھے بھائی کو سُلا کر آئی تھی
جلدی جلدی لوٹ کر آنا کہا تھا باپ نے
کوئی ایسا گیت مت گانا کہا تھا باپ نے
ہولے ہولے ماں نے بھی مجھ سے کہا تھا کان میں
گم نہ ہو جانا کسی کی بانسری کی تان میں
اپنے چھپر سے بڑے بھائی نے دی تھی یہ صدا
لڑکیوں کا رات کو پھرنا کبھی دیکھا نہ تھا
اے سکھی! تو راہ میں مجھ سے ملی تھی یاد ہے؟
میرا دل تو آج تک اس یاد سے آباد ہے
تو نے پوچھا تھا کہ کیوں پھولی ہوئی سی سانس ہے
کیا کسی کی یاد کی سینے میں تیرے پھانس ہے
اے سکھی وہ رات آئے گی کبھی پھر لوٹ کر

تصوّر

تصور اے تصوّر رحم فرما ہم غریبوں پر
اُداسی ہی اُداسی چھا رہی ہے غم نصیبوں پر

بس اتنا ہو جوانی لمحہ بھر کو منہ دکھا جائے
ہماری جاگتی بے چینیوں کو نیند آجائے

کہیں شاداب ٹیلوں کے کنارے سو رہے ہوں ہم
کہیں ماحول میں گیتوں کی کھیتی بو رہے ہوں ہم

جگر کو تھام کر دھیمے سروں میں گا رہے ہوں وہ
تمناؤں کو ٹھکرا کر مری پچھتا رہے ہوں وہ

کہیں آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر آنسو بہا دیں ہم
کہیں باہوں میں باہیں ڈالتے ہی مسکرا دیں ہم

کہیں ہم پھول بن کر کھل رہے ہوں لالہ زاروں میں
کہیں بیباکیاں کرتے نظر آئیں بہاروں میں

کہیں ہم لڑکھڑا کر چل رہے ہوں شاہراہوں پر
نہا کر دھر رہے ہوں وہ کہیں احساں نگاہوں پر

کہیں زلفوں سے باندھا جا رہا ہو میری باہوں کو
کہیں ہنس ہنس کے روکا جا رہا ہو میری آہوں کو

تصور اے تصوّر رحم فرما ہم غریبوں پر
اداسی ہی اداسی چھا رہی ہے غم نصیبوں پر

یہ کون ہے؟

مرے خیال کی بستی بسا رہا ہے کون ؟
یہ کس کی لے نے ہواؤں میں رقص فرمایا
کہ میکدہ میرے ہونٹوں سے آکے ٹکرایا
یہ کس کی آنکھ اُٹھی اور اُٹھ کے جُھک سی گئی
کہ بوتلوں میں شرابوں کی سانس رُک سی گئی
یہ کس کے پاؤں کی آہٹ ہوا میں لہرائی
کہ میرے دل میں اُٹھی ہوک لے کے انگڑائی
یہ کس کا ہاتھ میرے ہاتھ سے قریب ہُوا
کہ جاگتے ہیں مجھے اونگھنا نصیب ہُوا
یہ کس کے لب پہ تبسّم کا نور چمکا ہے
کہ میرا دل میرے سینے سے ہٹ کے دھڑکا ہے
یہ کس نے نیچی نگاہوں سے کچھ کہا مجھ کو
کہ زندگی کا بھروسہ نہیں رہا مجھ کو
یہ کون راتوں کو باجے پہ گیت گاتا ہے
کہ اپنے گھر کا مجھے رستہ بھول جاتا ہے
مرے خیال کی بستی بسا رہا ہے کون ؟

ہنسی کی مشعلیں تاریکیوں میں لَو نہیں دیتیں
مگر دو پُتلیاں شمس و قمر کا ہیں جواب اب تک
تری آنکھوں میں آوارہ ہے نغموں کا شباب اب تک
تری سانسوں سے گو اب جنّتیں پرہیز کرتی ہیں
گلوں کی نکہتیں ہونٹوں پہ لہرانے سے ڈرتی ہیں
کھلا ہے سرخ ڈوردں میں مگر گلشن کا باب ابتک
تری آنکھوں میں آوارہ ہے نغموں کا شباب ابتک
تری انگڑائیوں میں میکدے گو اب نہیں پلتے
ستاروں کے دیے تیرے تبسّم میں نہیں جلتے
مگر چشمِ حسیں کرتی ہے زاہد کو خراب اب تک
تری آنکھوں میں آوارہ ہے نغموں کا شباب اب تک
تری آنکھوں میں گو موسیقیوں کا رس نہیں باقی
نہیں ہے دلکشی کا قافلہ کوئی کہیں باقی
لرزتے ہیں مگر مژگاں میں لچکیلے سے خواب ابتک
تری آنکھوں میں آوارہ ہے نغموں کا شباب ابتک

(۷)

تری آنکھوں میں آوارہ ہے نغموں کا شباب اب تک

ترے ہونٹوں سے اب پھولوں کی گو بارش نہیں ہوتی
شفق رنگینیوں کا بیج گالوں میں نہیں بوتی
مگر بجتا ہے نظروں میں جوانی کا رباب اب تک
تری آنکھوں میں آوارہ ہے نغموں کا شباب اب تک

لچک سے ہو گئیں محروم گو تیری حسیں باہیں
ملیں گیتوں کے بدلے میں تجھے محشر بکف آہیں
برستی ہے مگر آنکھوں سے تھم تھم کر شراب اب تک
تری آنکھوں میں آوارہ ہے نغموں کا شباب اب تک

تری زلفوں کا بادل بھی اڑاتا ہے مذاق اب تو
گوارا ہے جوانوں کو بھی گو تیرا فراق اب تو
مگر نظریں الٹ دیتی ہیں زخموں سے نقاب اب تک
تری آنکھوں میں آوارہ ہے نغموں کا شباب اب تک

ترے گیتوں میں گو اب مستیاں کروٹ نہیں لیتیں

میری ہستی

مری ہستی عجب ہستی ہے اس خونخوار بستی میں

کسی مظلوم کے چہرے کو جب مغموم پاتا ہوں
تو مثلِ ماہیٔ بے آب بہرِ دل تلملاتا ہوں
یتیموں کی صدا جب آہ کے بربط پہ گاتی ہے
تو سینے سے کوئی شے دوڑ کر ہونٹوں کو آتی ہے
حنائی اُنگلیوں میں دیکھ کر کاسہ گدائی کا
اتر جاتا ہے چہرہ غم سے میری کبریائی کا
حسیں آنکھوں میں جب اشکوں کی شمعیں جگمگاتی ہیں
تو دل کو درد کی بے تابیاں آنکھیں دکھاتی ہیں
مسافر کی نظر میں پڑھ کے غم اندوز افسانے
مرے ماحول کی رنگینیاں لگتی ہیں شرمانے
دمکتے عارضوں کو گرد آلودہ جو پاتا ہوں
تو دل کو تھام کر راہوں میں اکثر بیٹھ جاتا ہوں
جوانی سے بڑھاپا کھانس کر پنجہ ملاتا ہے
تو میری آنکھ میں ساون کا بادل گنگناتا ہے

مری ہستی عجب ہستی ہے اِس خونخوار بستی میں

ساقی کی نگاہیں اور شراب

ان پیت نواسی آنکھوں سے جب کیف کے نغمے پھوٹتے ہیں
اور دیکھنے والے بیداری میں نیند کا جوبن لوٹتے ہیں
پلکوں پہ لئے میخانہ جب ساون کی گھٹائیں آتی ہیں
ہر سمت سے ظالم توبہ شکن مخمور صدائیں آتی ہیں
جب نیند کی رانی چپکے سے آنکھوں میں نیند انڈیلتی ہے
اور شام سے لے کر صبح تلک اک ٹیس جگر سے کھیلتی ہے
جب صحنِ چمن سے وقتِ سحر آلام کا بادل پھٹتا ہے
غنچوں میں عروسِ فطرت کے ہونٹوں سے تبسّم بٹتا ہے
جب درد کے مرہم سے شاعر زخموں کے دہن کو بھرتا ہے
احساس کی تصویر دل کو جب قرطاس کی زینت کرتا ہے
جب درد کی لہریں سینے کے ساحل پہ دم بھر اونگھتی ہیں
الطاف مرے پہلو میں جب کچھ حسن کی نظریں ڈھونڈتی ہیں
جب لیلئ مغرب کے در پہ سورج کی نگاہیں جھکتی ہیں
اور درد کے مارے انساں کی کچھ دیر کو آہیں رکتی ہیں
جب دل کے ساز کو بلا کی مدہوش نگاہیں چومتی ہیں
جب تارِ نفس کے پہلو میں نغموں کی گھٹائیں جھومتی ہیں
اُس وقت ملا کر صہبا میں ساقی کی نگاہیں پیتا ہوں
اور حُسن کی بیخود کرنوں سے زخموں کو کچھ کچھ سیتا ہوں

نیند کی پریاں نقابِ بیخودی ڈالے ہوئے
حسن کی تابانیوں کو قلب میں ڈھالے ہوئے

ند کی کرنوں میں چھپ کر رات کو آتی ہیں واں
اور ملائم خنکیاں بن بن کے چھا جاتی ہیں واں

نور گرتا ہے فضا میں بن کے سیمیں آبشار
راگنی کی آنچ کرتی ہے دلوں کو بے قرار

رہا ہے مست دریا نیند میں کھویا ہوا
ردائے نیلگوں کی گود میں سویا ہوا

بانسری کی لَے وہ چرواہوں کا رازِ زندگی
وجد میں آتا ہے جس کے دم سے سازِ زندگی

گونجتی ہے گاؤں کے ٹیلوں سے ٹکراتی ہوئی
بربطِ ناہید کے نغموں کو شرماتی ہوئی

حسن ہے یوں چادرِ افلاس میں لپٹا ہوا
چاند جیسے بادلوں کی گود میں سمٹا ہوا

الغرض الطاف بے خود سا ہوا جاتا تھا میں
ذرّے ذرّے کو وہاں کے دلربا پاتا تھا میں

بن کے سبزہ لیٹ جاؤں گا میں تیرے پاؤں میں
دُودھ دوہنے کی صدا پر جب لگے گی جھُومنے
بن کے گیسو سُرخ گالوں کو بڑھوں گا چومنے
جب برستی رات میں تو گائے گی میٹھے ملار
میں تمری آنکھوں میں بن جاؤں گا ساون کی پھوار
اس طرح جُرأت کروں گا عشق کے اظہار پر

شیخ چوگانی

شیخ چوگانی سپہرِ حُسن کا وہ آفتاب
شیخ چوگانی وہ سجدہ گاہِ دریائے چناب
جس کی پیشانی پہ رقصاں ہے زمانے کا وقار
غازۂ روئے ثریّا جس کے تلووں کا غبار
زمزموں کا زیر و بم جس کی رگوں میں تیز ہے
زلفِ موسیقی ہواؤں پر ترنّم ریز ہے

داغ بیل

اظہارِ عشق

اس طرح جرأت کروں گا عشق کے اظہار کی
کھیت کو جب جائے گی تو چھاچھ لیکر دھوپ میں
مسکراؤں گا جوانی بن کے تیرے روپ میں
بانسری کی لے میں تو ہو جائے گی گم جس گھڑی
میں تری آنکھوں میں بن جاؤں گا ساون کی جھڑی
رات کو چھیڑے گی تو چرخے کا جب رنگیں ستار
میں ترے نغموں میں بن جاؤں گا ہلکا سا خمار
صبحدم جب گائے گی چکی پہ تو میکے کا راگ
میں ترے سینے میں بن جاؤں گا امیدوں کی آگ
تو نہائے گی جو چھپ کر کیکروں کی باڑ میں
بلبلے کی آنکھ بن کر میں رہوں گا تاڑ میں
رات کے ہنگام سو جائے گی جب تو کھاٹ پر
خواب میں بن کر کوئی چھیڑوں گا تجھ کو گھاٹ پر
جب سنبھی تو جائے گی گرمی میں گیہوں کوٹنے
بجلیاں بن بن کے گالوں سے لگوں گا لوٹنے
دن ڈھلے جب لے کے چارہ آئیگی تو گاؤں میں

وعدہ

شہر کی شورش سے ہٹ کر مدھ بھری راوی کے پار
پھر کروں گا چاندنی راتوں میں تیرا انتظار
پھر جنوں انگیز گلیوں میں بصد حرمان و یاس
تھام کر دل کو پھروں گا ہو کے غمگیں اور اُداس
پھر بچھا کر تیرے رستے پر نگاہیں وقتِ شام
آنسوؤں کی سیمگوں مالا پہ لوں گا تیرا نام
پھر تجھے پر کیف راگوں میں بسا ڈالوں گا میں
پھر تجھے قابل پرستش کے بنا ڈالوں گا میں
پھر مرے شعروں میں بن کر جان در آئے گی تُو
پھر جوانوں کے حسیں خوابوں پہ چھا جائے گی تو
پھر تری آنکھوں میں کُھل جائے گا میخانے کا باب
پھر چھڑے گا تیری رگ رگ میں جوانی کا رباب
پھر ترے ہونٹوں میں ہو گی دھیمے نغموں کی مٹھاس
پھر تری زلفوں سے آئے گی حسیں پھولوں کی باس
پھر ترے مدہوش کُن ہلکے تبسّم کی ضیا
پھر پابوسی شعاعِ مہر کو دے گی صدا
پھر تجھے مغرور کر دوں گا شبوں کو جاگ کر
نوجوانی کے حسیں لمحوں کی خواہش تیاگ کر
اب نہیں جاؤں گا تجھ کو چھوڑ کر کچھ غم نہ کر
رحم کر ان مست آنکھوں پر انہیں پُرنم نہ کر

اے موت

ابھی تو کیف کی ندی بہائی ہے میں نے
ابھی تو بانسری منہ سے لگائی ہے میں نے
ابھی تو ایک جگر دوز انتظار کے بعد
نقابِ چہرۂ گلگوں اٹھائی ہے میں نے
ابھی تو کالی گھٹاؤں کی دیکھ کر مستی
کسی کی زلف کی سوگند کھائی ہے میں نے
ابھی تو کھیلنا سیکھا ہوں نرم پھولوں سے
شباب و شعر کی محفل جمائی ہے میں نے
ابھی تو حسن کی مخمور سی شعاعوں پر
جگر کو تھام کر اک چیز گائی ہے میں نے
ابھی تو کاکلِ عنبر فشاں کی لپٹوں سے
تخیلات کی دنیا بسائی ہے میں نے
ابھی تو میری جوانی نے آنکھ کھولی ہے
ابھی تو دولتِ احساس پائی ہے میں نے
خدا کے واسطے اے موت مجھ کو جینے دے
شرابِ زیست کے پُرکیف جام پینے دے

شکریۂ کشمیر

کشمیر کی حسین بہاروں کا شکریہ
دل چھین لینے والے نظاروں کا شکریہ

ہوتے ہیں آسمانِ محبت سے جو طلوع
ان برق در کنار ستاروں کا شکریہ

پھرتا ہے جن پہ حسن جوانی کی مے کے ساتھ
ان سحر بار رنگیں کناروں کا شکریہ

لیتی ہے جن میں کروٹیں پُر کیف راگنی
اُن ننھی ننھی مست پھواروں کا شکریہ

جو سُرخ دامنوں سے اُلجھتی ہیں وقتِ سیر
ان خوش نصیب شاخوں کے خاروں کا شکریہ

بدمست انکھڑیوں سے ٹپکتی ہے جو شراب
اس کے شباب خیز خماروں کا شکریہ

لے لے کے جن کو اٹھتی ہے محبوبۂ نگاہ
ان سبز، سُرخ، پیلے، سہاروں کا شکریہ

الطاف جا رہا ہوں میں مجبورِ روزگار
اللہ پھر دکھائے مجھے یہ حسیں دیار

داغ بیل

مجھے نہ چھوڑ کے جاؤ میں بے سہارا ہوں

مرے شباب سے اب زندگی نہ جھانکے گی
ستم نصیب کے لب سے ہنسی نہ جھانکے گی
نظر سے بھول کے بھی دلکشی نہ جھانکے گی
جگر کی آگ بجھاؤ میں بے سہارا ہوں
مجھے نہ چھوڑ کے جاؤ میں بے سہارا ہوں

میں سوچتی ہوں مری زندگی کا کیا ہوگا
میں بے نوا ہوں مرا کون ہم نوا ہوگا
تمہیں بتاؤ مجھے کس کا آسرا ہوگا؟
کوئی تو بات بتاؤ میں بے سہارا ہوں
مجھے نہ چھوڑ کے جاؤ میں بے سہارا ہوں

تمہارے دیس میں یوں ہی نباہ ہوتا ہے؟
ہر ایک دل یونہی مجبورِ آہ ہوتا ہے؟
کرے جو تم سے محبت تباہ ہوتا ہے؟
تباہیوں سے بچاؤ میں بے سہارا ہوں
مجھے نہ چھوڑ کے جاؤ میں بے سہارا ہوں

سماج گھور رہا ہے مری جوانی کو
عطا کرے گا کوئی زخم زندگانی کو
فروغ دے گا مرے عشق کی کہانی کو
کہانیاں نہ سناؤ میں بے سہارا ہوں
مجھے نہ چھوڑ کے جاؤ میں بے سہارا ہوں

داغ بیلی

دیہاتی لڑکی کا شہری محبوب سے خطاب

مری کھلی ہوئی باہوں پہ رحم میرے حبیب
دبی دبی ہوئی آہوں پہ رحم میرے حبیب
مری اداس نگاہوں پہ رحم میرے حبیب
غموں سے مجھ کو بچاؤ میں بے سہارا ہوں
مجھے نہ چھوڑ کے جاؤ میں بے سہارا ہوں

میں رو رہی ہوں سرِ راہ کوئی دیکھ نہ لے
اک اجنبی کے لئے آہ کوئی دیکھ نہ لے
ذرا سی عمر میں یہ چاہ کوئی دیکھ نہ لے
نظر نظر سے ملاؤ میں بے سہارا ہوں
مجھے نہ چھوڑ کے جاؤ میں بے سہارا ہوں

مرا فسانۂ غم عام کر کے جاتے ہو
ستم نصیب کو بدنام کر کے جاتے ہو
غضب کہ واقف آلام کر کے جاتے ہو
گری ہوئی کو اٹھاؤ میں بے سہارا ہوں
مجھے نہ چھوڑ کے جاؤ میں بے سہارا ہوں

مرا خیال تھا تم میرے ہو رہو گے کبھی
کوئی نہ جس کا بنا اس کے بن سکو گے کبھی
میں صرف تیرا ہوں چپکے سے یوں کہو گے کبھی
بچا سکو تو بچاؤ میں بے سہارا ہوں

خدا را میری باتوں میں نہ آنا
میں پردیسی ہوں مجھ کو بھول جانا

مجھے معلوم ہے تم غم کروگی
شبوں کو جاگ کر آہیں بھروگی
مری خاطر جوانی میں مروگی
مگر اک جا نہیں میرا ٹھکانا
میں پردیسی ہوں مجھ کو بھول جانا

مجھے ڈر ہے کہیں پنگھٹ پہ جاکر
حسیں پنہاریاں شانے ملاکر
نشیلی انکھڑیوں سے مُسکرا کر
نہ دُہرائیں ترے غم کا فسانا
میں پردیسی ہوں مجھ کو بھول جانا

میں جب اپنے وطن کو لوٹ جاؤں
نظر گلیوں میں جب تجھ کو نہ آؤں
افق کے اُس طرف بستی بساؤں
تو میری یاد میں مت تلملانا
میں پردیسی ہوں مجھ کو بھول جانا

دیہاتی محبوبہ سے
شہری سیّاح کا خطاب

حسیں آنکھوں سے آنسو مت بہانا
لبِ لعلیں کو آہوں سے بچانا
جوانی کو تڑپنا مت سکھانا
مری خاطر نہ شب کو تلملانا
میں پردیسی ہوں مجھ کو بھول جانا

سمجھ لینا کہ آوارہ سا کوئی
خرابِ عشق بیچارہ سا کوئی
یہاں پر ایک ناکارہ سا کوئی
رہا آکر بہ مشکل کچھ زمانا
میں پردیسی ہوں مجھ کو بھول جانا

مری اُلفت نہیں ہے جاودانی
پلی ہے شہر میں میری جوانی
ہوس کی جس جگہ ہے حکمرانی

دعوت نامہ

(ایک چاہنے والا محبوبہ کے نام اپنی شادی کا دعوت نامہ بھیجتا ہے)

اے مری جانِ تمنّا! کہہ نہیں سکتا ہوں میں
آہ لیکن بن کہے بھی رہ نہیں سکتا ہوں میں

کل جونہی کھولیگی گیسو دوش پر لیلائے شام
ٹوٹ جائیں گے مئے الفت کے دو لبریز جام

چاند جب کل کر رہا ہوگا جہاں والوں پہ راج
چھین لیگا تجھ کو میرے ہاتھ سے ظالم سماج

تیری باہیں میری گردن سے خفا ہو جائیں گی
آرزوئیں زندگی کا آسرا ہو جائیں گی

یعنی کل دیوار و در پر جب دھندلکا چھائیگا
مجھ کو اک نادیدہ لڑکی سے بیاہا جائے گا

اس قدر ہوگا عزیزوں کو مری راحت کا پاس
خانہ بربادی کو پہنائیں گے شادی کا لباس

اس قدر آئے گی اپنوں کی محبت جوش پر
جائیگا میرا جنازہ حسرتوں کے دوش پر

کل وطن میں جو بھی میرا ہے یہاں آئیگا وہ
ڈھا سکیگا جس قدر مجھ پر ستم ڈھائیگا وہ

تم بھی میری ہو تمہیں بھی منہ دکھانا چاہیئے
اتنے غیروں میں کوئی اپنا بھی آنا چاہیئے

میں تمہارا ہوں سمجھ لینا نہ ہیگا نہ مجھے
اپنے ہاتھوں سے کفن شادی کا پہنانا مجھے

ہاں مگر آنسو کسی صورت نہ آنکھوں سے بہیں
دیکھنے والے تجھے ننگِ محبت کیوں کہیں

آہ ہونٹوں پر ترے آئی اگر اچھا نہیں
عشق والوں کا یہ شیوہ ہے مگر اچھا نہیں

دل یہ کہتا ہے کہ کل تشریف لے آؤ گی تم
اس پریشانی میں مجھ پر رحم فرماؤ گی تم

قیصر کی جوانی

نظروں میں جنم لیتی ہوئی روحِ خرابات
زلفوں میں سمٹ جاتی ہوئی کوئی جواں رات
ابرو کے حسیں موڑ پہ جاگی ہوئی نظمیں
تخئیل کی آبادی سے بھاگی ہوئی نظمیں
پلکوں میں مدھر راگنی بل کھائی ہوئی سی
سینوں کی جنم بھومی کو نیند آئی ہوئی سی
بانہوں میں ہے مستورِ مصور کا حسیں خواب
ہاتھوں میں ہے کرنوں کی لچک بیخود و بیتاب
رخسار میں جنّت کی بہاروں کا خزینہ
دریا پہ مچلتا ہُوا پھولوں کا سفینہ
انگڑائیاں لیتی ہے جو ہنس ہنس کے سرِ بام
گر جاتا ہے نظروں سے مری بادۂ گلفام
جب گلیوں میں بھرتی ہے فسوں کار طرارے
میں ڈھونڈنے لگتا ہوں ہر اک سمت سہارے
جب گاتی ہے فطرت کا دھڑک اٹھتا ہے سینہ
آجاتا ہے ماحول کے ماتھے پہ پسینہ
چلتی ہے تو تھم جاتی ہے رفتارِ زمانہ
راہوں پہ لکھا جاتا ہے اک شوخ فسانہ
ہنستی ہے تو شرماتے ہیں افلاک پہ تارے
روتی ہے تو رو دیتے ہیں شاداب نظارے
اک نور کا طوفان لئے گھوم رہی ہے
پھلواری کا بہروپ بھرے جھوم رہی ہے

قیصر کی جوانی ہے کہ رومانی فسانہ
یا گایا ہُوا کرنوں کے بربط پہ ترانہ

مسکرائی ہے مقدر کا ستارا بن کر
میری تاریک فضاؤں کو اجالا بخشا
رات کے منہ میں شعاعوں کا نوالا بخشا
میرے ماحول پر انگڑائیاں بل کھانے لگیں
منزلیں میرے قدم چومنے کو آنے لگیں
نعمتِ مکرودریا سے ابھی محروم ہے وہ
رحم کھاؤ کہ بہت سادہ و معصوم ہے وہ
ظلم کی بخشی ہوئی رات نہیں بھولوں گا
آپ کے لطف و عنایات نہیں بھولوں گا
میری بے لوث محبت کی شکایت نہ کرو
میرے ہمدرد عزیزو! یہ عنایت نہ کرو



بھیک

میری بے لوث محبت کی شکایت نہ کرو
میرے ہمدرد عزیزو! یہ عنایت نہ کرو
میری محبوب ابھی واقفِ آلام نہیں
اس کی شاموں میں کوئی دردبھری شام نہیں
سرخ ہونٹوں سے بہت دور ہیں غم کے سائے
مست آنکھوں میں ابھی اشک نہیں لہرائے
اک سزاوارِ محبت سے جفا کرتے ہو
درد کا روگ جوانی میں عطا کرتے ہو
اس کے انفاس سے شعلوں کا تعارف نہ کراؤ
اس کی پلکوں میں المناک فسانے نہ چھپاؤ
اس کے رخسار ہیں مدہوش بہاروں کی نوید
اس کی پیشانی سے چھینو نہ طلوعِ خورشید
وہ مری زیست میں اتری ہے سہارا بن کر

مناظر کی گود میں

بکھرنے لگیں گیسوؤں کی گھٹائیں — نگاہوں سے کہدو شرابیں لُٹائیں
لبوں پر ہوں رقصاں تبسّم کی صبحیں — شبابوں میں انگڑائیاں گنگنائیں
کھلیں مست جھونکوں میں خوابوں کے جادُو — مناظر کوئی رس بھرا گیت گائیں
ہر اک گام پر میکدے کھل رہے ہوں — فسانے ہر اک موڑ پر مسکرائیں
دریچوں سے شادابیاں جھانکتی ہوں — در و بام دیتے ہوں رنگیں صدائیں
میسّر ہوں ہنگامِ بادہ پرستی — مہکتے ہوئے آنچلوں کی ہوائیں
فضاؤں میں ناچیں ترنم کی پریاں — ترنم میں شیرینیاں سرسرائیں
گلستاں اُگلتی ہوں بدمستیوں میں — مہکتے ہوئے گیسوؤں کی گھٹائیں
نشیلے نشیلے ترانوں کے شیشے — گریں دستِ قدرت سے اور ٹوٹ جائیں
لچکتی ہوئی نرم باہوں کے ہالے — جھجکتی ہوئی گردنوں کو بُلائیں

یہ موسم ہو الطاف اور ہم سمٹ کر
صراحی کی آغوش میں ڈوب جائیں

وہ کہاں ہے

یہی ماحول اُسے گود میں لے کر جھوما — اسی وسعت نے اُسے بھینچ کے اکثر چوما
انہیں راہوں نے اسے مست خرامی دی تھی — انہیں گلیوں نے اسے جھک کے سلامی دی تھی
وہ گزرتی تھی تو نغمات بکھر جاتے تھے — وقت کی گود میں باغات بکھر جاتے تھے
مست جلووں نے اُسے طور بنا کر چھوڑا — شوخ اداؤں نے اسے حور بنا کر چھوڑا
اُس کی پائل میں شرابوں کا بسیرا دیکھا — اُس کی پازیب میں نغمات کا ڈیرا دیکھا
اُس کی زلفوں میں کئی شامیں سمٹ جاتی تھیں — اس کے ہونٹوں سے حسیں صُبحیں لپٹ جاتی تھیں
سبز کھیتوں نے اُسے زیست کا ساماں سمجھا — گلستانوں نے اُسے جانِ گلستاں سمجھا
لبِ گلرنگ میں ان دیکھی پھبن رہتی تھی — بانسری اُس کے قصائد میں مگن رہتی تھی

کون سی بستی میں آباد ہے معلوم نہیں
میری مقبول مری ماہ لقا زہرہ جبیں

ایک سراپا

لبوں پہ ایک ترانہ سمٹ کے سویا ہوُا
نظر میں ایک فسانہ سمٹ کے سویا ہوُا
رخِ جمیل میں کچھ طور گنگناتے ہوئے
لبوں کے موڑ پہ کچھ پھول مسکراتے ہوئے
حسین راگنی پلکوں میں تھرتھراتی ہوئی
سیاہ زلف گھٹاؤں پہ مسکراتی ہوئی
ہنسی میں چاند ستاروں کے ان گنت ٹکڑے
نفس نفس میں بہاروں کے ان گنت ٹکڑے
رگوں سے جھانکتی ہے کوئی اک شفق زادی
روئیں روئیں میں ہے موسیقیوں کی آبادی
لچکتی اُنگلیاں کرنوں کے رُوپ میں دیکھو
گلابی چہرے کو جلوؤں کی دُھوپ میں دیکھو
پڑھے گی نظم نسیم اور مسکرائیگی
فلک پہ چاند ستاروں کو نیند آئیگی

پنگھٹ

تھکی تھکی ہوئی انگڑائیوں کا گہوارہ — رُکی رُکی ہوئی سرگوشیوں کا فوارہ
کہیں چھلکتے ہوئے نرم عارضوں کے ہجوم — کہیں تھرکتی ہوئی سرخ پنڈلیوں کے ہجوم
حسیں کلائیوں پہ چھڑ رہے ہیں دیپک راگ — برس رہی ہے فضا پر تجلیات کی آگ
ہر اک نگاہ میں اک میکدہ تھرکتا ہے — ہر ایک ہونٹ پہ اک گلستاں مہکتا ہے
ہر ایک اوڑھنی اک طُور کو سنبھالے ہوئے — ہر اک دوپٹہ کسی حُور کو سنبھالے ہوئے
دلوں کے کھیل حسیں گاگروں کی اوٹوں میں — قریبِ شہر کہیں ساگروں کی اوٹوں میں
جوانیاں ہیں جو اس حُسن کی سرائے میں — پلی ہوئی ہیں یہ موسیقیوں کے سائے میں
نفس نفس میں ہیں فردوس مسکرائے ہوئے — شباب چاندنی کے کیف میں نہائے ہوئے
نشہ میں بھیگی ہوئی کنواریاں ارے توبہ — لچکتی جھومتی پنہاریاں ارے توبہ

کوئی جوانی جو پنگھٹ پہ گنگناتی ہے
تو جاگتے ہوئے منظر کو نیند آتی ہے

دم سادھ کے رُک جائیگی ہر چلتی درانتی   آداب کو جھک جائیگی ہر چلتی درانتی
چُومیں گی قدم جھومتے کھیتوں کی جبینیں
شاداب زمینیں
چل میری درانتی چل میری درانتی

نغموں کی تڑپ، حسن کی ضو، مست ترنم   ہونٹوں کے شفق زار میں لچکیلا تبسّم
عارض کی دمک، گیسوئے خمدار کی راتیں   آنکھوں سے ادا ہوتی ہوئی رس بھری باتیں
دامن میں سمیٹے ہوئے آئے گی چھنا چھن
سو وادیٔ ایمن
چل میری درانتی ، چل میری درانتی

یہ میرا شباب اُس کی جوانی یہ مرے کھیت   لرزیدہ نگاہوں کی کہانی یہ مرے کھیت
عارض میں جھلکتی سی یہ نایاب شرابیں   گالوں میں تھرکتی سی یہ خود تاب شرابیں
ڈر ہے کہ کہیں زر کے درندے نہ چڑھا جائیں
ہم کو نہ چبا جائیں
چل میری درانتی ، چل میری درانتی

کھیتوں کی گلستاں کی گل و خار کی سوگند   گیہوں کے لگائے ہوئے انبار کی سوگند
لب ہائے حسیں دیدۂ مے بار کی سوگند   ہونٹوں پہ چمکتے ہوئے انوار کی سوگند
اس گاؤں کی ہر بستی کو بخشوں گا میں عظمت
جھیلوں گا مصیبت
چل میری درانتی ، چل میری درانتی

ہراس

ماحول کو مسحور کیئے میری فسوں کار
انگڑائیاں لے لے کے ہوئی نیند سے بیدار
پازیب کی جھنکار نے کچھ گیت بکھیرے
موسیقیوں نے رقص کیا ڈال کے گھیرے
آئے گی ابھی کھیتوں میں دوشیزہ جوانی
وہ پھولوں کی رانی
چل میری درانتی، چل میری درانتی

جب دودھ بلوتے ہوئے چھیڑے گی ترانہ
موسیقیوں کی گود میں کھیلے گا زمانہ
دوہے گی بصد ناز جونہی جھومتی گائیں
کانپیں گی حسیں ہونٹوں پہ معصوم نوائیں
گلیوں میں نظر آئیں گے مستانہ طرارے
وہ شہد کے دھارے
چل میری درانتی، چل میری درانتی

کچھ گائے گی جب سر پہ رکھے چھاچھ کا برتن
ہونٹوں میں سمٹ آئے گا فردوس کا گلشن
ناچیں گے ہر اک سمت فسوں کار اشارے
بچھ جائیں گے پگڈنڈی کی آغوش میں تارے

قیصر جہاں وہ تم ہو؟
گایا جو تم نے دیپک ہر دل میں آگ بھڑکی   سن کر بلاس خانی مُردوں کی نبض دھڑکی
ملہار چھیڑتے ہی برسا فلک سے پانی
کہتی ہے جس کو دنیا موسیقیوں کی رانی
قیصر جہاں وہ تم ہو؟
مدہوش چاندنی میں گایا جونہی کدارا   مرقد نے تیرگی کو آغوش میں پکارا
سن کر بہار ہنس دی پھولوں کی راجدھانی
کہتی ہے جس کو دنیا موسیقیوں کی رانی
قیصر جہاں وہ تم ہو؟
استھائی اور ٹپہ سجدے میں جھک رہے ہیں   شیرینیوں کے دریا تانوں میں رک رہے ہیں
گلشن خیال میں بھی کوئی نہیں ہے ثانی
کہتی ہے جس کو دنیا موسیقیوں کی رانی
قیصر جہاں وہ تم ہو؟
شاعر ترے سُروں میں تحلیل ہو چکا ہے   نغموں کی وسعتوں میں تحلیل ہو چکا ہے
اب تیرے ہاتھ میں ہے شاعر کی زندگانی
کہتی ہے جس کو دنیا موسیقیوں کی رانی
قیصر جہاں وہ تم ہو؟

قیصر جہاں وہ تم ہو؟

ہونٹوں پہ بچھ رہی ہیں موسیقیوں کی راہیں — آنکھیں بنی ہوئی ہیں نغموں کی سیرگاہیں
پلکوں میں چھڑ رہی ہے گیتوں بھری کہانی
کہتی ہے جس کو دنیا موسیقیوں کی رانی
قیصر جہاں وہ تم ہو؟

تانوں میں میکدوں کا دربار ہو رہا ہے — مدہوشیوں کا مرکز ہر ساز ہو رہا ہے
سُر کو لئے ہوئے ہے آغوش میں جوانی
کہتی ہے جس کو دنیا موسیقیوں کی رانی
قیصر جہاں وہ تم ہو؟

درگا، اڈانا، چھایا باگیشری تمہیں سے — بھیروں، بلاس خانی راگیشری تمہیں سے
دیپک، ملار دیسی بھرتے ہیں جس کا پانی
کہتی ہے جس کو دنیا موسیقیوں کی رانی
قیصر جہاں وہ تم ہو؟

ٹوڈی نے راستے میں آنکھیں بچھا رکھی ہیں — بیتاب سوہنی نے پلکیں اٹھا رکھی ہیں
بیخواب و منتظر ہے سیماب وار دھانی
کہتی ہے جس کو دنیا موسیقیوں کی رانی

کبھی باہوں میں باہیں ڈال کر ہم گنگنائے تھے
کبھی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر ہم مسکرائے تھے
مری سلمیٰ مری برباد و رسوا اب کہاں ہے تو

ترانوں کی نشیلی وسعتوں میں کھو گئی ہے تو
تخیّل کے حسیں زانو پہ اکثر سو گئی ہے تو
مرے اشعار میں گویا مجسّم ہو گئی ہے تو

مرے ویران نغمے تیری یادوں نے بسائے تھے
کبھی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر ہم مسکرائے تھے
مری سلمیٰ مری برباد و رسوا اب کہاں ہے تو

قسم ہے تیری الفت کی کہ تن من دھن کو واروں گا
تجھے ہر سو زمانے میں صدا دوں گا پکاروں گا
میں اپنی زندگی کو رونے دھونے میں گزاروں گا

گئے وہ دن کہ ہم جی کھول کر راتوں کو گائے تھے
کبھی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر ہم مسکرائے تھے
مری سلمیٰ مری برباد و رسوا اب کہاں ہے تو

قسم ان نرم باہوں کی جو گردن کا سہارا تھیں
قسم نظروں کی جو میرے مقدر کا ستارا تھیں
قسم ہونٹوں کی جن سے جنّتیں تک آشکارا تھیں

کہ تیری راہ میں الطاف نے سجدے بچھائے تھے
کبھی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر ہم مسکرائے تھے
مری سلمیٰ مری برباد و رسوا اب کہاں ہے تو

وہ گلیاں جن کی پلکوں نے ترے قدموں کو چُوما تھا
وہ گلیاں جن میں اکثر کاروانِ حُسن جھوما تھا
ترا بیمار دل تھامے ہوئے راتوں کو گھوما تھا
انہیں گلیوں نے تیری یاد میں آنسو بہائے تھے
کبھی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر ہم مسکرائے تھے
مری سلمٰی مری برباد و رسوا اب کہاں ہے تو

تری ہمجولیاں گیتوں میں تیرا نام لیتی ہیں
حسیں یادوں میں گُم ہو کر کلیجہ تھام لیتی ہیں
تری چاہت کا خود پر جھُوم کر الزام لیتی ہیں
کبھی ان غم زدوں نے تم سے مل کر گیت گائے تھے
کبھی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر ہم مسکرائے تھے
مری سلمٰی مری برباد و رسوا اب کہاں ہے تو

ہمارے عشق میں حائل ہوئی دیوار مذہب کی
ہماری گردنوں پر چل گئی تلوار مذہب کی
بڑھی بربادیوں سے رونق بازار مذہب کی
وہی مذہب کہ جس کی گود میں جنت کے سائے تھے
کبھی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر ہم مسکرائے تھے
مری سلمٰی مری برباد و رسوا اب کہاں ہے تو

مری آنکھوں میں ساون گا رہی ہیں مست برساتیں
مقدر پر مسلط ہو چکی ہیں سانولی راتیں
لبوں پر خیمہ زن ہیں درد میں ڈوبی ہوئی باتیں

داغ بیل

سلمیٰ سے خطاب

تیری یادوں نے رسوا کر دیا مجھ کو زمانے میں
جہانِ بے کسی آباد ہے میرے فسانے میں
مجھے رونے کی لذّت مل رہی ہے مسکرانے میں
کبھی گاتی ہوئی راہوں میں ہم نے گیت گائے تھے
کبھی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر ہم مسکرائے تھے
مری سلمیٰ مری برباد و رسوا اب کہاں ہے تو

عزیزوں کی محبت نے نگل لیں راحتیں اپنی
اجڑ کر رہ گئیں بسنے سے پہلے جنّتیں اپنی
زمانے میں ہوئیں برباد و رسوا اُلفتیں اپنی
ابھی کل تک ہماری روح پر خوابوں کے سائے تھے
کبھی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر ہم مسکرائے تھے
مری سلمیٰ مری برباد و رسوا اب کہاں ہے تو

بٹی جاتی ہے میری زندگی اب سرد آہوں میں
مجھے احباب نے روتے ہوئے دیکھا ہے راہوں میں
مری رسوائیوں کے تذکرے ہیں شاہراہوں میں
تصوّر میں کبھی ہم نے گھروندے بھی بنائے تھے
کبھی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر ہم مسکرائے تھے
مری سلمیٰ مری برباد و رسوا اب کہاں ہے تو

چھوڑ کر مجھ کو چلی جاؤ گی معلوم نہ تھا

عید آئی تھی مگر اپنی تو یہ عید نہ تھی
تیرۂ و تار فضا حالِ خورشید نہ تھی
مجھ کو برباد کرو گی مجھے اُمید نہ تھی
عید کے روز بھی ترساؤ گی معلوم نہ تھا
لوٹ کر پھر نہ کبھی آؤ گی معلوم نہ تھا
چھوڑ کر مجھ کو چلی جاؤ گی معلوم نہ تھا

کس قدر موت کو اپنانے میں آسانی ہے
میں نے بھی مان لیا اب کہ جہاں فانی ہے
اب مری زیست کسی دشت کی ویرانی ہے
اپنے اس ظلم پہ اتراؤ گی معلوم نہ تھا
لوٹ کر پھر نہ کبھی آؤ گی معلوم نہ تھا
چھوڑ کر مجھ کو چلی جاؤ گی معلوم نہ تھا

درد آلود فضا طاری ہے سارے گھر میں
قہقہہ تک نہیں گونجا کبھی پیارے گھر میں
حسرت و یاس مسلّط ہے تمہارے گھر میں
گھر کو ٹھکرا کے چلی جاؤ گی معلوم نہ تھا
لوٹ کر پھر نہ کبھی آؤ گی معلوم نہ تھا
چھوڑ کر مجھ کو چلی جاؤ گی معلوم نہ تھا

رحم تک مجھ پہ نہ تم کھاؤ گی معلوم نہ تھا
لوٹ کر پھر نہ کبھی آؤ گی معلوم نہ تھا
چھوڑ کر مجھ کو چلی جاؤ گی معلوم نہ تھا

کیا یہ ممکن نہیں بھولے سے مجھے یاد کرو
میرے اُجڑے ہوئے ماحول کو آباد کرو
میں تمہیں چاہتا ہوں مجھ کو نہ برباد کرو
میرے خوابوں سے بھی چھن جاؤ گی معلوم نہ تھا
لوٹ کر پھر نہ کبھی آؤ گی معلوم نہ تھا
چھوڑ کر مجھ کو چلی جاؤ گی معلوم نہ تھا

گیت اک درد بھرا ہونٹوں سے برساتے ہوئے
اپنے ہاتھوں میں حسیں ہاتھوں کو سہلاتے ہوئے
میں نے اللہ کو سونپا تھا تمہیں جاتے ہوئے
اپنے اللہ سے پھر جاؤ گی معلوم نہ تھا
لوٹ کر پھر نہ کبھی آؤ گی معلوم نہ تھا
چھوڑ کر مجھ کو چلی جاؤ گی معلوم نہ تھا

مجھ سے چھینو نہ امیدوں کا سہارا قیصر
آ بھی جاؤ کہ نہیں صبر کا یارا قیصر
میں بُرا ہوں کہ بھلا ہوں تو تمہارا قیصر
اپنے الطاف کو ٹھکراؤ گی معلوم نہ تھا
لوٹ کر پھر نہ کبھی آؤ گی معلوم نہ تھا

قیصرا

جو مقدر میں ہو تحریر وہی ہوتا ہے
میری بیداری میں مقسوم مرا سوتا ہے
دیکھ کر مجھ کو یہ ماحول لہو روتا ہے

تم مری زیست پہ چھا جاؤ گی معلوم نہ تھا
لوٹ کر پھر نہ کبھی آؤ گی معلوم نہ تھا
چھوڑ کر مجھ کو چلی جاؤ گی معلوم نہ تھا

اک حسیں جسم کی خوشبو ہے فضاؤں میں اب تک
گلستاں تیرتے ہیں بادِ صبا میں اب تک
تم نہیں لوچ تمہارا ہے ہواؤں میں اب تک

ان حسیں یادوں سے تڑپاؤ گی معلوم نہ تھا
لوٹ کر پھر نہ کبھی آؤ گی معلوم نہ تھا
چھوڑ کر مجھ کو چلی جاؤ گی معلوم نہ تھا

میری راتوں کو تھپکتا نہیں کوئی افسوس
میرے خوابوں میں دھڑکتا نہیں کوئی افسوس
پیار کی آنکھ سے تکتا نہیں کوئی افسوس

دہریا تمدن نہ تجھے زہر پلا دے
اے اجڑے ہوئے گاؤں مجھے اتنا بتا دے
ویرانیاں کیوں خون ترا چاٹ رہی ہیں؟

آقاؤں کی آبادی میں بکتی ہے شرافت
گدرائے ہوئے جسموں کی ہوتی ہے تجارت
اک بھیس میں رہتی ہیں ہوس ہو کہ محبت

ناپاک فضا تجھ کو نہ یہ روگ لگا دے
اے اُجڑے ہوئے گاؤں مجھے اتنا بتا دے
ویرانیاں کیوں خون ترا چاٹ رہی ہیں

صحراؤں کی شہزادی خدا تیرا محافظ
بربادوں کی آبادی خدا تیرا محافظ
اے شام وسحر زادی خدا تیرا محافظ

اللہ تری مشکلیں آسان بنا دے
اے اجڑے ہوئے گاؤں مجھے اتنا بتا دے
ویرانیاں کیوں خون ترا چاٹ رہی ہیں

———:o:☆:o:———

پیڑوں کے ہیں جھلسے ہوئے رنگین لبادے
اے اجڑے ہوئے گاؤں مجھے اتنا بتا دے
ویرانیاں کیوں خون ترا چاٹ رہی ہیں؟
دریاؤں کے آئینہ میں گلکاری کہاں اب
پگڈنڈی کی آغوش میں پھلواری کہاں اب
صحراؤں کی وسعت میں فسوں کاری کہاں اب
برباد منازل ہیں تو ویران ہیں جادے
اے اجڑے ہوئے گاؤں مجھے اتنا بتا دے
ویرانیاں کیوں خون ترا چاٹ رہی ہیں؟
دامن میں فسوں کار نظاروں کو سمیٹے
اس ملک کی شاداب بہاروں کو سمیٹے
چلدی ہے وہ پلکوں میں ستاروں کو سمیٹے
سینے میں سنبھالے ہوئے مجروح ارادے
اے اجڑے ہوئے گاؤں مجھے اتنا بتا دے
ویرانیاں کیوں خون ترا چاٹ رہی ہیں
پردیس میں بے داغ رہے تیری جوانی
ڈس لے نہ تجھے کوئی ہوسناک کہانی
بن جائے نہ تو شہد سے اچھوت کا پانی

اک "جانِ ترنّم" ہو تو سب روگ مٹا دے
اے اُجڑے ہوئے گاؤں مجھے اتنا بتا دے
ویرانیاں کیوں خون ترا چاٹ رہی ہیں؟

ہر بام سے ہے ویران نہیں طور کا عالم
دیواروں کے سائے ہیں کہاں نور کا عالم
ماحول پہ ہے اک شبِ دیجور کا عالم
کوئی مجھے بچھڑے ہوئے ماضی سے ملا دے
اے اُجڑے ہوئے گاؤں مجھے اتنا بتا دے
ویرانیاں کیوں خون ترا چاٹ رہی ہیں؟

چرواہوں کو بنسی سے کوئی کام نہیں ہے
ٹیلوں کی حسیں اوٹوں میں آرام نہیں ہے
اب گیتوں سے معمور کوئی شام نہیں ہے
اے وقت مری راہ سے یہ شامیں ہٹا دے
اے اجڑے ہوئے گاؤں مجھے اتنا بتا دے
ویرانیاں کیوں خون ترا چاٹ رہی ہیں؟

ہر اونٹ کی گھنٹی پہ ہے نیندوں کی سواری
بھیڑوں کی حسیں ٹولیاں ہیں درد کی ماری
اک سوز بھرا گیت کھجوروں پہ ہے طاری

اُجڑا ہوا گاؤں

اب گلیوں میں پازیب کی جھنکار نہیں ہے
کھیتوں میں مرے عشق کی بہار نہیں ہے
پنگھٹ پہ بھی وہ سادہ و پُرکار نہیں ہے
حالات کے چہرے سے ذرا پردہ اٹھا دے
اے اُجڑے ہوئے گاؤں مجھے اتنا بتا دے
ویرانیاں کیوں خون ترا چاٹ رہی ہیں

کیا ڈھوروں کے ہمراہ کہیں دُور گئی ہے
سرسبز علاقوں میں مری حُور گئی ہے
میں جانتا ہوں ہو کے وہ مجبور گئی ہے
اللہ! مرے ملک کو شاداب بنا دے
اے اُجڑے ہوئے گاؤں مجھے اتنا بتا دے
ویرانیاں کیوں خون ترا چاٹ رہی ہیں؟

کیوں ہونٹوں کی جنت میں تبسم کی کمی ہے
چوڑوں کی زبانوں پہ تکلّم کی کمی ہے
تہبند کی سرسر میں ترنّم کی کمی ہے

سسکیوں میں بانٹ ڈالے جھومتے گاتے شباب
گرم آہوں کو پلا دی سرخ ہونٹوں کی شراب
یہ ستم اور پھر ستم ایجاد کیوں مقبول ہے
لڑکیوں میں شاعرِ برباد کیوں مقبول ہے

آنسوؤں کے نامہ بر بڑھ کر صدا دینے لگے
درد کے دریا دلوں میں کروٹیں لینے لگے
عشق کے ملاح غم کی کشتیاں کھینے لگے
ہائے وہ آوارہ و آزاد کیوں مقبول ہے
لڑکیوں میں شاعرِ برباد کیوں مقبول ہے

کاش شاعر بھی محبت پر کبھی مجبور ہو
اس کی آنکھوں میں بھی ساون کی جھڑی مستور ہو
اُس کے دل میں بھی کسی کی یاد کا ناسور ہو
آہ وہ طوفانِ برق و باد کیوں مقبول ہے
لڑکیوں میں شاعرِ برباد کیوں مقبول ہے

———— :٠:)٭(:٠: ————

لڑکیوں میں شاعرِ برباد کیوں مقبول ہے

پائلوں کی جھنجھناہٹ نیند میں گم ہو گئی
چوڑیوں کی راگنی کروٹ بدل کر سو گئی
مسکراہٹ کی کرن تاریکیوں میں کھو گئی
اس پہ بھی وہ خوگرِ بیداد کیوں مقبول ہے
لڑکیوں میں شاعرِ برباد کیوں مقبول ہے

حُسن پوشیدہ تھا جتنا چلمنوں کی آڑ میں
جس قدر کلیاں چھپی تھیں پتّیوں کی باڑ میں
آ گئیں شاعر کے باعث بجلیوں کی تاڑ میں
دل ہیں جس کے درد سے آباد، کیوں مقبول ہے
لڑکیوں میں شاعرِ برباد کیوں مقبول ہے

شاعری میں سحر کی تاثیر ہے تو کیا ہُوا
ہر غزل ہر شعر اک تصویر ہے تو کیا ہُوا
یا کسی رومان کی تفسیر ہے تو کیا ہُوا
اہلِ گلشن میں مگر صیاد کیوں مقبول ہے
لڑکیوں میں شاعرِ برباد کیوں مقبول ہے

آنسوؤں سے تر کیے ہیں کس قدر رنگیں نقاب

ساحر لدھیانوی

شاعرِ برباد کیوں مقبول ہے......

کتنی آغوشوں کو ہے ارمان اُس برباد کا
کتنی امیدوں پہ ہے احسان اُس برباد کا
اس پہ بھی پانا نہیں آسان اُس برباد کا
اس قدر ہر دل میں اس کی یاد کیوں مقبول ہے
لڑکیوں میں شاعرِ برباد کیوں مقبول ہے

کتنے غنچوں کا تبسم آنسوؤں میں بہہ گیا
میکدہ ویرانیوں کا جورِ بے حد سہہ گیا
حسن اک شاعر کی خاطر عشق بن کر رہ گیا
ہر حسیں بستی میں وہ ناشاد کیوں مقبول ہے
لڑکیوں میں شاعرِ برباد کیوں مقبول ہے

کتنی باہیں اُٹھ چکیں مایوس ہونے کے لئے
کتنی تقدیریں ہوئیں مجبور سونے کے لئے
کتنی انکھڑیاں آنسو پرونے کے لئے
داہیں اتنے نغموں میں وہ اک فریاد کیوں مقبول ہے

۲۶

مقدّر ہی اپنا اور دل کی طرح الزام دے زمانے کا
یہ اپنی زندگی پشت کو زندگی کٹنی کا نام دے زمانے کا

الطاف

شباب

بغاوت

رگوں میں زلزلے باہوں میں طوفاں بغاوت زندگی کی رازداں ہے
مرے باطن کی گہرائی میں جھانکو بغاوت کارداں درکارواں ہے

جبر

جس کا حاصل ہے فقط چند گھُٹی سی سانسیں
ایسے جینے کو میں ٹھکرا کے چلا جاؤں گا
نطق پہ پہرے ہیں الطاف لبوں پر تالے
جبر ہے درپئے آزار چلا جاؤں گا

سرحدِ شفق آلود

حقائق کے اجالے کہہ رہے ہیں   عقائد کی بصارت چھن چکی ہے
کئی صدیوں میں اب اوہام کی رَو   شفق آلود سرحد پر رُکی ہے

اعتراف

وہ مست مست فضاؤں میں ایک چاند اُبھرا   وہ پستیوں نے بلندی پہ ہاتھ صاف کیا
وہ زندگی کا بم و زیر ہو گیا ہموار   وہ مہر و ماہ نے ذرّوں کا اعتراف کیا

مذہب و قانون

مُردہ کُتّے کو چبایا میں نے کل پچھلے پہر   بھوک سے آنتوں میں رقصاں شعلۂ بے دُود تھا
میری مجبوری پہ لیکن اے خدائے کارساز!   مذہب و قانون کا ماتھا شکن آلود تھا

ہمارے آقا

ہم وفاداروں کی جانب مسکرا کر دیکھئے
دشمنوں کا خون حاضر ہے نہا کر دیکھئے
لونڈوں کا رقص بھی مرغوب ہے سرکار کو
لونڈوں کے رقص سے بھی لطف اٹھا کر دیکھئے

نوچ لو

آسمانوں کی قباؤں سے ستارے نوچ لو
بحر کی امواج وسعت سے کنارے نوچ لو
آسماں سے باتیں کرنے کی اجازت اب نہیں
ہر بلندی سے ستونوں کے سہارے نوچ لو

تاش کے پتے

اینٹ ہی کے غلام نے توڑا حکم کے شاہ کا طلسمِ غرور
یہ توقع بھی ہو گئی پوری کتنی مایوسیوں کے ہوتے ہوئے
اینٹ کی سرخیوں ہی سے ہارا حکم کی ظلمتوں کا بوڑھا وقار
سرخیاں آ رہی ہیں وہ دیکھو ظلمتوں کو رکھوں میں جوتے ہوئے

امتیازِ مُلک و قوم

میری فطرت حدوں کی دشمن ہے
اور جغرافیہ تجھے مرغوب
میں تو انسان کا پُجاری ہوں
میرا قاتل بھی ہے مرا محبوب

صبر کا پھل

سُرخیاں سُرخ رُو فسانوں کی
اور حقائق پہ زردیاں طاری
صبر کا پھل لذیذ ہوتا ہے
جاگنے کو ہیں خالقِ باری

ساتھیو!

ساتھیو ساتھ چھُٹ گیا لیکن
تم ہمارے ہو ہم تمہارے ہیں
تم سے ملنے کو کچھ خبر بھی ہے؟
ہم نے راہوں کے رخ سنوارے ہیں

قطعات

یہ انقلاب

خون بہتا تھا شعلے اُٹھتے تھے عصمتوں کو شہید ہونا تھا
یہ بھی قسمت ہی پر سہی الزام ہر بشر کو یزید ہونا تھا

تعبیرِ خوابِ آزادی

میں تو سمجھا تھا اب غبار چھٹا اب فریبوں کا زہر کیوں کھائیں
تجربے کا مگر یہ کہنا ہے ان امیدوں سے جی نہ بہلائیں

ہولی

ندّیوں میں گلال کی لہریں مرقدوں پر بہار چھائی ہے
ابنِ آدم سے پوچھتا ہوں میں کتنی صدیوں کو ہولی آئی ہے

ماغ بیل

سلمیٰ سے

تری صورت سے سلمیٰ تیری سیرت خوبصورت ہے
مجھے مدّت سے اک ایسی ہی ساتھی کی ضرورت ہے
ترے نغموں سے خوابستان کو بیداریاں دوں گا
غرور آباد کی تقدیر کو ناداریاں دوں گا
ترے ہونٹوں کا رس مرہم بنے گا زخمِ ہستی کا
تری چتون سے ہوگا فیصلہ شوکت پرستی کا
تری آنکھوں کا نشّہ زندگی کو زندگی دے گا
ترا آنسو نئے ماحول کو تابندگی دے گا
تری رنگت گلوں کی زردیوں پر آزماؤں گا
ہنسی کے چاند تارے ظلمتوں پر آزماؤں گا
تری زلفوں کا بادل اجنبی سورج پہ چھائے گا
ترا عزمِ جواں بوڑھے خداؤں کو مٹائے گا
ترے افکار سے اوہام کی دنیا بدل دوں گا
تری شیرینیاں آلام کے چہرے پہ مَل دوں گا
تری رنگین ساری ایک پرچم میں بدل دوں گا
تجھے محلوں سے لے کر جھونپڑوں کی سمت چل دوں گا
تری صورت سے سلمیٰ تیری سیرت خوبصورت ہے
مجھے مدّت سے اک ایسی ہی ساتھی کی ضرورت ہے

وطن کے غریبوں کی حالت تو دیکھو یہ مر مر کے جینے کی عادت تو دیکھو
مجھے ان سے الفت ہے مزدور ہوں میں
وطن کی محبت پہ مجبور ہوں میں
ضرورت ہے میرے لہو کی وطن کو
چھپا لو دمکتے ہوئے عارضوں کو ہٹا لو دمکتے ہوئے عارضوں کو
تمہارا نہیں میں مجھے بھول جاؤ نشیلی نظر سے نہ بے خود بناؤ
شجاعت کی صہبا سے مخمور ہوں میں
وطن کی محبت پہ مجبور ہوں میں
ضرورت ہے میرے لہو کی وطن کو
تمہاری محبت سے بیگانہ ہو کر وطن کی محبت میں دیوانہ ہو کر
گلابی لبوں کی حلاوت سے بچ کر شرابی لبوں کی حلاوت سے بچ کر
تمہیں کیا خبر کتنا مسرور ہوں میں
وطن کی محبت پہ مجبور ہوں میں
ضرورت ہے میرے لہو کی وطن کو
یہ کیا کہہ رہی ہو کہ کٹ جاؤ گے تم مصائب کے جبڑوں میں بٹ جاؤ گے تم
حوادث کے جمگھٹ میں گھر جاؤ گے تم جوانی کی نظروں سے گر جاؤ گے تم
زمانہ کے ماتھے پہ مسطور ہوں میں
وطن کی محبت پہ مجبور ہوں میں
ضرورت ہے میرے لہو کی وطن کو

محبوبہ سے خطاب

خدا را نہ آنکھوں سے آنسو بہاؤ   مرے غم میں دل کو نہ بیکل بناؤ
یہ آنکھیں شرابوں کے ساغر ہیں جن میں   جوانی نے جادو جگائے ہیں جن میں
ان آنکھوں کی زد سے بہت دور ہوں میں
وطن کی محبت پہ مجبور ہوں میں
ضرورت ہے میرے لہو کی وطن کو

ترے سرخ لب اور سیہ فام گیسو   یہ ڈسنے کے عادی یہ بدنام گیسو
نگاہوں کے میخانے ویران کر دوں   وطن کی محبت پہ قربان کر دوں
زمانے میں گو تیرا مشہور ہوں میں
وطن کی محبت پہ مجبور ہوں میں
ضرورت ہے میرے لہو کی وطن کو

یہ سب جانتا ہوں کہ لٹ جاؤ گی تم   جوانی میں جینے سے اکتاؤ گی تم
جوانی تمہاری ہے دل شاد مجھ سے   تصور کی دنیا ہے آباد مجھ سے
دھڑکتی تمنا میں مستور ہوں میں
وطن کی محبت پہ مجبور ہوں میں
ضرورت ہے میرے لہو کی وطن کو

مجھے مسکرانے کی فرصت نہیں ہے   نظر تک ملانے کی فرصت نہیں ہے

یہ لیڈر ہمارا دیا کھانے والے　　یہ قومیں کی قومیں نگل جانے والے
مجھے ان سے کوئی لگاؤ نہیں ہے
وطن کی امانت ہے میری جوانی

یہ توندیں جو بڑھتی چلی جا رہی ہیں　　یہ ندیاں جو چڑھتی چلی جا رہی ہیں
گھنی ڈاڑھیاں اور نورانی چہرے　　تقدّس کے غازے میں شیطانی چہرے
مجھے ان سے کوئی لگاؤ نہیں ہے
وطن کی امانت ہے میری جوانی

وطن کے لئے مجھ کو پالا ہے ماں نے　　جوانی کے سانچے میں ڈھالا ہے ماں نے
جوانی مری زلزلوں کی جوانی　　حوادث کے ہونٹوں پہ میری کہانی
میں مردوں کو جینا سکھا کر رہوں گا
وطن کی امانت ہے میری جوانی

جوانی مری بے کسوں کا سہارا　　وطن کے غریبوں کی آنکھوں کا تارا
یہ شعلوں پہ لہرا کے باقی رہے گی　　یہ توپوں سے ٹکرا کے باقی رہے گی
یہی ہے مرا مقصدِ زندگانی
وطن کی امانت ہے میری جوانی

———:o:☆:o:———

یہ بربط یہ نغموں کی آباد بستی   تبسّم کا جادو ترنّم کی مستی
مجھے ان سے کوئی لگاؤ نہیں ہے
وطن کی امانت ہے میری جوانی

یہ ساون کی رُت یہ نشیلی فضائیں   یہ میخانہ بردوش کالی گھٹائیں
یہ ریشم میں لپٹے ہوئے نرم بازو   یہ پھولوں سے ملتے ہوئے گرم بازو
مجھے ان سے کوئی لگاؤ نہیں ہے
وطن کی امانت ہے میری جوانی

یہ مسکاتا جوبن یہ شربائی آنکھیں   یہ نیچی یہ ترچھی یہ گھبراتی آنکھیں
یہ پازیب کے ساز کا گنگنانا   حسینوں کا چلتے ہیں محشر اُٹھانا
مجھے ان سے کوئی لگاؤ نہیں ہے
وطن کی امانت ہے میری جوانی

یہ نیندوں کا عالم یہ خوابوں کی دُنیا   ہرے، سُرخ، نیلے نقابوں کی دُنیا
یہ پردوں کے پردے میں اک بیحیائی   یہ ساغر بکف جھومتی پارسائی
مجھے ان سے کوئی لگاؤ نہیں ہے
وطن کی امانت ہے میری جوانی

یہ معبد یہ ملّت فروشی کے اڈّے   خصومت، کدورت فروشی کے اڈّے

وطن کی امانت

یہ آنکھوں میں پھیلے ہوئے سرخ ڈورے　یہ لبریز ساغر یہ رنگیں کٹورے
یہ مہکے ہوئے نرم ہونٹوں کی باتیں　شرابوں میں کھوئی ہوئی مست راتیں
مجھے ان سے کوئی لگاؤ نہیں ہے
وطن کی امانت ہے میری جوانی
یہ ٹھنڈی ہوائیں یہ بہتے سفینے　یہ پینے کے دن یہ بہکتے مہینے
یہ ساقی یہ مطرب یہ میٹھے ترانے　نگاہوں میں کروٹ بدلتے فسانے
مجھے ان سے کوئی لگاؤ نہیں ہے
وطن کی امانت ہے میری جوانی
یہ باہیں یہ باہوں میں گاتے سے جوڑے　مدھر راگنی گنگناتے سے جوڑے
یہ شانے یہ شانوں پہ لہراتے گیسو　یہ ناگوں کی مانند بل کھاتے گیسو
مجھے ان سے کوئی لگاؤ نہیں ہے
وطن کی امانت ہے میری جوانی
یہ پلکیں یہ پلکوں کی اوٹوں میں اک شے　یہ ہنسی یہ ہنسی کے ہونٹوں پہ اک لے

جو چاندی کے ٹکڑے چباتی تھیں ان کا جو سونے کے آنسو بہاتی تھیں ان کا
تمسخر اڑاتی ہوں دوشیزہ بن کر
میں راتوں کو جاتی ہوں دوشیزہ بن کر
جوانی کو سکوں میں تبدیل کرنے

بہت تلملائے غریبوں کے حامی غضب میں بھی آئے غریبوں کے حامی
رہی جھومتی پھر بھی سرمایہ داری گجر دم چلے جیسے بادِ بہاری
یہ مشکل نہ آساں ہوئی لیڈروں سے وہ طاقت نہ حیراں ہوئی لیڈروں سے
میں محشر اٹھاتی ہوں دوشیزہ بن کر
میں راتوں کو جاتی ہوں دوشیزہ بن کر
جوانی کو سکوں میں تبدیل کرنے

محبت کو بیچا جوانی کو بیچا نگاہوں کی جادو بیانی کو بیچا
تبسم کی شیرینیاں بیچ ڈالیں تکلم کی رنگینیاں بیچ ڈالیں
مگر اہلِ زر کا لہو چوس ڈالا وہ دیکھو تجوری وہ ہیروں کی مالا
میں پربت جھکاتی ہوں دوشیزہ بن کر
میں راتوں کو جاتی ہوں دوشیزہ بن کر
جوانی کو سکوں میں تبدیل کرنے

مرے سرخ لب اور شرابی ادائیں شفق زار عارض گلابی قبائیں
تکبر کو نیچا دکھاتی رہی ہیں جھکاتی رہی ہیں مٹاتی رہی ہیں
فلک بوس ایواں ہیں اور بے کسی ہے غرورِ امارت ہے اور مفلسی ہے
فلک بھی جھکاتی ہوں دوشیزہ بن کر
میں راتوں کو جاتی ہوں دوشیزہ بن کر
جوانی کو سکوں میں تبدیل کرنے

انتقام

میں افلاس کی گود میں پل رہی تھی میں آلام کی آگ میں جل رہی تھی
خوشی دل میں بھولے سے آتی نہیں تھی مسرت نگاہیں ملاتی نہیں تھی
مجھے بھی ضرورت تھی میں بھی جواں تھی مرے دل میں حسرت تھی میں بھی جواں تھی
مزا اب اٹھاتی ہوں دوشیزہ بن کر
میں راتوں کو جاتی ہوں دوشیزہ بن کر
جوانی کو سکّوں میں تبدیل کرنے
مرا دل بھی تھا آرزوؤں کی بستی مجھے بھی تھی مرغوب فیشن پرستی
مری نرم باہیں تھیں چوڑے سے خالی نہ زلفوں میں بل تھے نہ ہونٹوں پہ لالی
جوانی مری گنگناتی نہیں تھی دلوں کو دھڑکنا سکھاتی نہیں تھی
میں تانیں اڑاتی ہوں دوشیزہ بن کر
میں راتوں کو جاتی ہوں دوشیزہ بن کر
جوانی کو سکّوں میں تبدیل کرنے
مجھے بھی تھا کافر ادا بن کے رہنا مجھے بھی تھا رنگیں قبا بن کے رہنا
مجھے بھی تھا ریشم کا ملبوس پیارا تھی سکّوں کی جھنکار کیسے گوارا
مزاحق نہیں تھا میں انساں نہیں تھی کہ جیسے مرے جسم میں جاں نہیں تھی
میں دھومیں مچاتی ہوں دوشیزہ بن کر
میں راتوں کو جاتی ہوں دوشیزہ بن کر
جوانی کو سکّوں میں تبدیل کرنے
جو آغوشِ راحت میں سوئی ہوئی تھیں امارت کے نشہ میں کھوئی ہوئی تھیں
غریبوں کو جو دیکھ سکتی نہیں تھیں جفا کرتے کرتے جو تھکتی نہیں تھیں

ابلیس

میں اکثر سوچتا ہوں کس قدر نادان ہے دُنیا
وہ جس کے نام سے موسیقیوں کا رس ٹپکتا ہے
شمیمِ جانفزا کا مخملیں دامن مہکتا ہے
وہ جس کی مسکراہٹ میں ستارے جھلملاتے ہیں
وہ جس کے عنبریں لہجے میں ساغر گنگناتے ہیں
وہ جس کی یاد میں سرمستیاں کروٹ بدلتی ہیں
جوانی کی حسیں پریاں شرابی ہو کے چلتی ہیں
تصور میں کبھی جب جھوم کر آنکھیں ملاتا ہے
تو میرے ناتواں ہاتھوں سے ساغر چھوٹ جاتا ہے
وہ جس کے مست کُن سائے سے جنّت جھینپ جاتی ہے
تھکے ہارے ہوؤں کو راحتوں کی نیند آتی ہے
شریعت جس کی خوابوں سے حسیں معلوم ہوتی ہے
حسینوں کے نقابوں سے حسیں معلوم ہوتی ہے
گناہوں سی حسیں شے جس نے دنیا کو عطا کی ہے
ترنم آفریں شے جس نے دنیا کو عطا کی ہے
وہ خود داری کے دریا جس کی شریانوں میں بہتے ہیں
نہیں آتا سمجھ میں کیوں اُسے ناپاک کہتے ہیں
میں اکثر سوچتا ہوں کس قدر نادان ہے دنیا

جھونکے کی تمنّا

الٰہی! نرم رخساروں کو چُوموں یہ نہیں خواہش
بہکتی انکھڑیوں سے پی کے جھوُموں یہ نہیں خواہش
نہیں خواہش کہ زلفوں کی گھٹاؤں سے لپٹ جاؤں
لبِ گلرنگ کی دلکش حلاوت کا مزا پاؤں
چمن میں گنگنانے کی تمنّا ہی نہیں مجھ کو
کلی کے گدگدانے کی تمنّا ہی نہیں مجھ کو
نہیں خواہش نئے الفت سے پھولوں کے شجر سینچوں
جوانی کے شرابی قہقہوں کو گود میں بھینچوں
میں گھبراتا ہوں چشمِ مست سے آنکھیں ملانے میں
میں شرماتا ہوں دوشیزاؤں سے شانہ لڑانے میں
تمنّا ہی نہیں دامن حسیں چہروں سے سرکاؤں
نشیلے زمزموں کو شوق سے پلکوں پہ بٹھلاؤں
مجھے بھاتی نہیں اک آنکھ جلووں کی حسیں وادی
جواں، مدہوش کن، رنگیں، ترنم آفریں وادی
مری نظروں میں عارض کی دمک بھی ہیچ ہے یارب
مری نظروں میں اعضا کی لچک بھی ہیچ ہے یارب
تمنّا ہے مجاہد کھیلتے ہوں جب شراروں سے
وطن کا نام چمکاتے ہوں تلواروں کی دھاروں سے
میں بن کر سانس اُن کے آہنی سینوں کو گرماؤں
حیاتِ جاودانی کا جہاں میں مرتبہ پاؤں

داغ بیل

مضطرب ہے تیری شریانوں میں خونِ انقلاب

مذہب و قانون کو ٹکڑے کیا اچھا کیا
شیخ کے ہاتھوں سے جامِ مے پیا اچھا کیا
باغیوں کو وصل کا ساغر دیا اچھا کیا
شرم کے چہرے سے تو نے نوچ کر رکھدی نقاب
مضطرب ہے تیری شریانوں میں خونِ انقلاب

عصمتیں عہدوں کی قیمت پر بکیں تو خوب ہے
خوشنما محلوں کے بدلے گر بکیں تو خوب ہے
ریشمیں پردوں میں چھپ چھپ کر بکیں تو خوب ہے
ہو نہ لیکن پیٹ کی خاطر گنہ کا ارتکاب
مضطرب ہے تیری شریانوں میں خونِ انقلاب

صبر اے عصمت کی دیوی صبر کچھ دن اور بھی
دندناتا آرہا ہے انقلابی دور بھی
بدلے بدلے ہیں جوانانِ وطن کے طور بھی
ماند پڑنے کو ہے زہریلے تمدن کا شہاب
مضطرب ہے تیری شریانوں میں خون انقلاب

تیری غیرت نے دکھائی تجھ کو یہ راہِ ثواب
مضطرب ہے تیری شریانوں میں خونِ انقلاب

تو نے مذہب کو جھکایا دہریت کے پاؤں میں
دخترِ رز مسکرائی ڈاڑھیوں کی چھاؤں میں
کعبہ و بتخانہ کھنچ آئے ہیں تیرے پاؤں میں
تجھ کو سجدہ ہے روا اے اشترا کی آفتاب
مضطرب ہے تیری شریانوں میں خونِ انقلاب

قوم بیچو، روح بیچو، آن بیچو، کچھ نہیں
نوجوانانِ وطن کی جان بیچو، کچھ نہیں
اور یہ سستی سی شے ایمان بیچو، کچھ نہیں
جسم لیکن بک نہیں سکتا کہ ہے کارِ عذاب
مضطرب ہے تیری شریانوں میں خونِ انقلاب

رات کی تاریکیوں میں عزّتیں بکتی رہیں
کوٹھیوں کی خلوتوں میں عصمتیں بکتی رہیں
زر کے انباروں کی خاطر عفتیں بکتی رہیں
اک سرِ بازار لیکن بک نہیں سکتا شباب

طوائف

تیری مظلومی بدل دے گی یہ فرسودہ نظام
دوسری تسبیح کے دانوں پہ لے گی تیرا نام
ظلم کی دنیا پہ چھا جائے گی جب تاریک شام
وہ بھی دن نزدیک ہیں اے زندگانی کے شباب
مضطرب ہے تیری شریانوں میں خونِ انقلاب

تیری آہیں پھونک ڈالیں گی زمین و آسماں
سینۂ مزدور سے اُٹھّے گا غیرت کا دھُواں
راکھ میں تبدیل ہو جائیں گے رفعت کے نشاں
اک نئی تہذیب کے چہرے سے اُٹھّے گا نقاب
مضطرب ہے تیری شریانوں میں خونِ انقلاب

بھیک کے ٹکڑوں پہ جینا تجھ کو بھاتا کس طرح
حسن تیرا ٹھوکروں میں گنگناتا کس طرح
زر کی چوکھٹ پہ کوئی گردن جھکاتا کس طرح

خواب کی تعبیر

آج ہر لب پر تھرکتی ہے صدائے انقلاب
خار و خس میں کروٹیں لیتا ہے پتھریلا شباب
آج شریانوں میں رقصاں ہے بغاوت کا لہو
آج لہراتے ہیں آزادی کے پرچم چار سو
آج خونی برچھیوں کو چومتے ہیں نوجواں
پاؤں رکھ کر لوتھڑوں پر گھومتے ہیں نوجواں
آج ہر ایوانِ شاہی مرکزِ آلام ہے
گورے گورے ہونٹ ہیں اور بیکسی کا جام ہے
آج اُن سیمیں بدن گڑیوں کا دل ناشاد ہے
موت جن سے جھک کے کہتی تھی کہ کیا ارشاد ہے
آج ہر جانب گلابی گردنوں کے ڈھیر ہیں
اور ان ڈھیروں پہ رقصاں کالے کالے شیر ہیں
آج وہ مغرور سر ہیں باغیوں کے پاؤں میں
ظلم لیتا تھا جنم جن کی نشیلی چھاؤں میں
آج اُن مخمور آنکھوں سے ٹپکتا ہے لہو
جھومتے تھے جن کی نظروں میں خم و جام و سبو
آج اُن ہونٹوں کو تیروں میں پرویا جائیگا
جو یہ کہتے تھے غلاموں کو ڈبویا جائے گا
آج کھینچی جائے گی اُن زر پرستوں کی زباں
جو یہ کہتے تھے میسّر تم کو آزادی کہاں
ارغوانی گوشت کتّوں کو کھلایا جائے گا
راستوں میں بھورے بالوں کو بچھایا جائے گا
ریشمیں باہوں کو انگاروں پہ بھونا جائے گا
اور ہر اک بھوک کا بیمار ان کو کھائے گا

ہمنشیں شاید یہ تعبیرِ دلِ ناشاد ہے
خواب ہی دیکھا ہے میں نے یا وطن آزاد ہے

آ رہی ہے کس طرف سے ہانپتی ناڑنے والے کی نظریں بھانپتی
شب کو پیدا ہونے والا کیا ہؤا؟ بیج غم کا بونے والا کیا ہؤا؟
پھینک آئی ہے اُسے مرگھٹ کے پاس ٹوٹ کر پھر جُڑ گئی جینے کی آس
کنواری لڑکی اور ماں بن کر جیئے
بڑھ رہے ہیں روز و شب ساتھی مرے

رُوحِ فطرت شاعرِ جادُو بیاں زندگانی کی زباں کے ترجماں
تُو نے رنگِ عاشقانہ چھوڑ کر زلف کے ناگوں سے رشتہ توڑ کر
بو دیے ہر سو بغاوت کے شرار اب جواں ہیں اور تلواروں کی دھار
کٹ رہے ہیں آگے بڑھنے کے لئے زندگی پر بھینٹ چڑھنے کے لئے
کون زنجیروں کے سائے میں جیئے
بڑھ رہے ہیں روز و شب ساتھی مرے

جس کی خواہش ہو یہ فرسودہ نظام خون پینے والا بیہودہ نظام
راکھ میں تبدیل ہونا چاہیئے موت کے پہلو میں سونا چاہیئے
دھجّیاں اس کی فضاؤں میں اڑیں بوٹیاں اس کی ہواؤں میں اُڑیں
وہ مرا ساتھی ہے میری آن ہے جان بھی اس پر مری قربان ہے
جو لہو سرمایہ داری کا پیئے
بڑھ رہے ہیں روز و شب ساتھی مرے

سننے والوں پر حقائق کھل گئے   دل بغاوت پر یکایک تُل گئے
مسکراہٹ چھا گئی نزدیک و دُور   جاگ اُٹھا انگڑائیاں لے کر سرود
خواجگی بیٹھی ہے سر نیچا کئے
بڑھ رہے ہیں روز و شب ساتھی مرے

جانے والے یہ لہو کے داغ کیوں   بن رہا ہے تو سراپا باغ کیوں
تیری آنکھیں کہہ رہی ہیں دل کا راز   باغیوں کو ہے تری جرأت پہ ناز
تجھ کو بھی سوجھی ہے کیسی دُور کی   کاٹ لی گردن کسی مغرور کی
دے اجازت پاؤں تیرے چُوم لوں   چُوم لوں اور مست ہو کر جھُوم لوں
لڑکھڑاؤں میں بھی کچھ دن بے پئے
بڑھ رہے ہیں روز و شب ساتھی مرے

اے گلابی آنکھ والے بات سُن   اور شرابی آنکھ والے بات سن
کس لئے مٹکے ہیں یہ بکھرے ہوئے   اور آئینہ صفت نکھرے ہوئے
بھر کے رکھے ہیں یہ ”خانہ ساز“ سے   پا گیا ہوں میں تری آواز سے
غم کدہ رنگینیوں سے بھر دیا   زندگی کا بول بالا کر دیا
ہے دعا تُو حشر کے دن تک جیئے
بڑھ رہے ہیں روز و شب ساتھی مرے

کون ہے یہ کون ہے زیرِ نقاب   اے جوانی، اے جوانی، اے شباب

میرے ساتھی

نوجواں اے انقلابی نوجواں جھومتے، گاتے، شرابی نوجواں
یہ تجوری وہ خزانہ لوٹ لے لوٹ لے سارا زمانہ لوٹ لے
لوٹ لے یہ آسمانی رفعتیں سیم و زر کی جاودانی رفعتیں
زندگی کا تجھ کو دم بھرنا ہے آج زندگی کو زندگی کرنا ہے آج
راہزن اور موت سے ڈر کر جیئے؟
بڑھ رہے ہیں روز و شب ساتھی مرے

اے حسینہ اے جوانی کی بہار چند روزہ زندگانی کی بہار
لیٹتے ہی سو گیا شوہر ترا نیند میں گم ہو گیا شوہر ترا
اب تجھے جانا ہے اس نالے کے پار بھول آئی تھی جہاں عصمت کا ہار
چلتے چلتے جھک گئی تھی جس جگہ دو گھڑی کو رک گئی تھی جس جگہ
دل میں ارمانوں کی اک دنیا لئے
بڑھ رہے ہیں روز و شب ساتھی مرے

اے مقرّر! زندگی کے راز دار تیری تقریریں ہیں کتنی آب دار
خون میں ڈوبے ہوئے کلمات ہیں آگ کے شعلے ہیں یا فقرات ہیں

سُسرال

ستم نصیب ہوں لِلّٰہ راز داں ! نہ سُن
مرے شباب کے لٹنے کی داستان نہ سُن
بتاؤں کیا تجھے سُسرال کیسی بستی ہے
ہر ایک چیز وہاں سانپ بن کے ڈستی ہے
دُلھن کے چہرے سے گھونگھٹ سرک گیا تو غضب
شکیب و صبر کا ساغر چھلک گیا تو غضب
دلوں پہ برق گرانا وہاں نصیب کہاں
تھرکنا ناچنا گانا وہاں نصیب کہاں
کوئی کسی سے وہاں مسکرا نہیں سکتا
شباب بھول کے بھی گنگنا نہیں سکتا
وہاں کنوئیں پہ کوئی چھیڑنے نہیں آتا
گزرتے دیکھ کے اک گیت تک نہیں گاتا
کسی کو زیرِ مکاں گھومتے نہیں دیکھا
نشیلی انکھڑیوں پر جھومتے نہیں دیکھا
نہ دل کشی ہے وہاں اور نہ دلربائی ہے
بس ایک سُسرال میں خدائی ہے

بھوک

رو رہا ہے میرے ہمسائے کا بچّہ کیا کروں

جی میں آتا ہے طبیعت کی روانی بیچ دوں
ایک دوشیزہ کی الفت کی کہانی بیچ دوں
جو کسی کی سیمگوں باہوں میں لہراتی رہی
ایک روٹی کے عوض وہ نوجوانی بیچ دوں
جو دلوں کی وادیوں میں گنگناتی عمر بھر
چند ٹکڑوں کے عوض وہ زندگانی بیچ دوں
جو کسی کی سُرمگیں آنکھوں میں محوِ رقص ہے
دل یہ کہتا ہے وہ انگوروں کی رانی بیچ دوں
جو جوانی کے اُجڑ جانے پہ بھی محفوظ ہے
آج کوئی لے تو وہ اشکوں کا پانی بیچ دوں
جو جوانی نے عطا کی ان کی چشمِ مست کو
میرے بس میں ہو تو وہ جادو بیانی بیچ دوں
یہ زمیں یہ آسماں یہ رفعتیں یہ عظمتیں
ایک بچّے کے لئے دنیائے فانی بیچ دوں

رو رہا ہے میرے ہمسائے کا بچّہ کیا کروں

غریب اور نظارے

ستم شعار نظارو! بہت غریب ہوں میں

شعاعِ مہر کی ہنستی ہوئی سنہری کمند
دیارِ دل میں خدارا نہ ڈال اپنا کمند

حسین غنچو! تمہیں اپنی دلکشی کی قسم
نظر ملا کے کرو اس طرح نہ وقفِ الم

گلو! نہ دیکھ کر اس طرح مسکراؤ مجھے
پیامِ موت جوانی میں مت سناؤ مجھے

بہارِ باغِ جہاں کی حسین دوشیزہ!
بچا کہ پھٹ نہ پڑے آنسوؤں کا مشکیزہ

اُداس ٹیلوں میں گونجی ہوئی سی بانگِ درا!
ستم نصیبِ محبت ہوں بجلیاں نہ گرا

نسیمِ صبح کے جھونکو! ذرا کرم کی نگاہ
کہ خیمہ زن ہے مرے دل میں حسرتوں کی سپاہ

بساطِ چرخ پہ بکھرے ہوئے حسین تارو!
میں اس عتاب کے قابل نہیں رہا پیارو

ستم شعار نظارو! بہت غریب ہوں میں

بیہودہ نظام

سُن شریکِ زندگی سُن بات سُن
کیوں نہیں کٹتی یہ کالی رات سُن

کیوں اجیرن ہو گیا جینا مرا
آگ کے شعلے ہیں اور سینہ مرا

تھوکتی ہیں کیوں مری آنکھیں لہو
زندگی کو موت کی ہے جستجو

آہ یہ روداد میں کیسے کہوں
کس طرح نوکِ سناں دل پر سہوں

کل فضا پر چھا رہا تھا جب دھُواں
قافلے تاریکیوں کے تھے رواں

شام کی دیوی تھی اور اس کا شباب
اُٹھ رہا تھا رات کے رخ سے نقاب

آ رہی تھی ایک لڑکی ہانپتی
تاڑنے والے کی نظریں بھانپتی

گاؤں کے نالے سے آگے ریت میں
جھاڑیوں کے اس طرف اک کھیت میں

لٹ گئی اس کی جوانی کی بہار
ہو گیا عصمت کا چہرہ داغدار

اُس کی چیخیں آسمانوں تک گئیں
کچھ نہ سننے والے کانوں تک گئیں

آنکھ میں ساون کی رُت لہرا گئی
دل کی دھڑکن پر جوانی آ گئی

گرم آہیں لب پہ آئیں بار بار
اور نہ برسے آسمانوں سے شرار

خالقِ کون و مکاں سوتا رہا
رازقِ ہر دو جہاں سوتا رہا

گاؤں کے اونچے زمینداروں سے ایک
ظلم کے بانی ستمگاروں سے ایک

کر گیا معصوم لڑکی کو تباہ
چھا گیا آلام کا ابرِ سیاہ

جس میں انساں اس قدر مجبور ہو
زندہ رہ کر زندگی سے دور ہو

سیم و زر کا ناگ ہو اور مفلسی
خواجگی کی آگ ہو اور مفلسی

عزتیں قیمت میں کم ہوں خاک سے
عصمتیں ارزاں خس و خاشاک سے

ایسا ظالم اور فرسودہ نظام
خون پینے والا بیہودہ نظام

راکھ میں تبدیل ہونا چاہیئے
موت کے پہلو میں سونا چاہیئے

سزائیں

چشمِ مدہوش کو نمناک بنانا ہوگا
میری محبوب! غمِ زیست اُٹھانا ہوگا

بھوک کی دُھوپ جُھلس دیگی گلابی چہرہ
ظلم کی آگ میں پھولوں کو جلانا ہوگا

تیرگی جبر کی ماتھے پہ چپک جائے گی
موت کی نیند مقدّر کو سُلانا ہوگا

سانپ آلام کا چاٹیگا لبوں کی سُرخی
دیوِ بیداد کو سینے سے لگانا ہوگا

مرمریں جسم پہ رینگیں گے غموں کے سائے
روح کو خوگرِ آزار بنانا ہوگا

میکدہ سازِ جوانی کی پڑے گی قیمت
بھوک کا روگ کسی طور گنوانا ہوگا

غم سے معمور فضاؤں میں گھٹیں گی سانسیں
یاس کا زہر امنگوں کو پلانا ہوگا

زندہ احساس کے ہونٹوں پہ پڑینگے تالے
دل کی آواز کو سینے میں دبانا ہوگا

مفلسی بڑھ کے حمیّت کا گلا گھونٹے گی
صبر کی سرخ سلاخوں کو چبانا ہوگا

میری محبوب! تجھے سخت سزائیں سہہ کر
بھٹکے انسان کو رستے پہ لگانا ہوگا

چشمِ مدہوش کو نمناک بنانا ہوگا
میری محبوب! غمِ زیست اُٹھانا ہوگا

یہ زنجیریں وہ دیواریں یہ توڑوں وہ ڈھاؤں

ہ لڑکی وہ مست، منوہر، کومل، بھولی بھالی
یں اس کے درشن کا لوبھی وہ میری متوالی
یں بھوکا وہ سونے کے انبار نگلنے والی
من ہی من میں سوچ چکا ہوں جیون روگ گنواؤں
یہ زنجیریں وہ دیواریں یہ توڑوں وہ ڈھاؤں

پھلواری رس ان شیشوں میں ان شیشوں میں پانی
کچھ شیشوں میں ناچ رہی ہے انگوروں کی رانی
میری آنکھوں کے شیشوں میں اک غمناک کہانی
من ہی من میں سوچ چکا ہوں جیون روگ گنواؤں
یہ زنجیریں وہ دیواریں یہ توڑوں وہ ڈھاؤں

ہ صوفے وہ ایرانی قالین، کھنکتی مایا
ہ کوٹھی وہ کوٹھی میں مایا کی ٹھنڈی چھایا
مجھ نردھن پر چلتا کے بھتنوں کا خونی سایا
من ہی من میں سوچ چکا ہوں جیون روگ گنواؤں
یہ زنجیریں وہ دیواریں یہ توڑوں وہ ڈھاؤں

سوچ چکا ہوں اپنے بل پر جیون جوت جگاؤں
سونے چاندی کے بت توڑوں من کی آگ بجھاؤں
لوبھ کی نگری میں اکتا کا میٹھا نغمہ گاؤں
من ہی من میں سوچ چکا ہوں جیون روگ گنواؤں
یہ زنجیریں وہ دیواریں یہ توڑوں وہ ڈھاؤں

اچھوت

وہ دیکھو اک کار کھڑی ہے چمکیلی چمکیلی
نرم گدیلے رنگیں پردے لچکیلی پھرتیلی
میری باہیں میری راتیں پتھریلی پتھریلی
من ہی من میں سوچ چکا ہوں جیون روگ گنواؤں
یہ زنجیریں وہ دیواریں یہ توڑوں وہ ڈھاؤں

نوندوں کے جھرمٹ میں دیکھو اک مدہوش جوانی
مدھوا پی کر یوں گاتی ہے جیسے بہتا پانی
ناچ رہی میری آنتوں میں فاقوں کی رانی
من ہی من میں سوچ چکا ہوں جیون روگ گنواؤں
یہ زنجیریں وہ دیواریں یہ توڑوں وہ ڈھاؤں

مندر میں دیکھو ہر جانب رام تپسیا جاری
جھوم رہی ہے ہر ہردے میں آشا کی پھلواری
میں ایشور بھگتی کو جاؤں کانپ اٹھیں سنساری
من ہی من میں سوچ چکا ہوں جیون روگ گنواؤں
یہ زنجیریں وہ دیواریں یہ توڑوں وہ ڈھاؤں

پیاس لگے جس نر ناری کو بھاگ کنوئیں پہ آئے
میٹھے جل کی شیتل دھارا سب کی پیاس بجھائے
میرے چھو لینے سے جل بھی زہریلا ہو جائے
من ہی من میں سوچ چکا ہوں جیون روگ گنواؤں

دیکھتا کیا ہے کہ اک عصمت کی دیوی خاک پر
منتظر ہے بے نوا کب وہ خدائے ذوالمنن
ماتمِ خاموش ہے گھر پر مسلّط اس طرح
حیرتیں ہیں نعشِ بے گور و کفن پر نوحہ خواں
آتی ہے گھر کے جھرونکوں سے ہوائے برفبار
ماں کی جانِ آرزو غربت کے پروردہ یتیم
گھر کی حالت دیکھ کر اندوہگیں عسرت فزا
ننھے بچّوں کو بنظرِ غور دیکھا اور کہا
آہ یہ تو اس کے بچّے ہیں جو دستِ قہر سے
آہ وہ مزدور پردیسی وجسمِ ناتواں
یہ کہا اور نعش کو ہاتھوں پہ لے کر اُڑ گیا
اہلِ گردوں نے کیا پُرحشمت و شوکت تپاک
اس کے بچّے درسِ عبرت ہیں زمانے کے لئے

دیکھتی ہے دیدۂ بے نور سے افلاک پر
بھیجتا ہے خلد سے میرے لئے زرّیں کفن
دُور ویرانے میں پردیسی کی تربت جس طرح
یاس کی مضرابِ تارِ اشک پر جیسے رواں
چھیدتے ہیں سنکے جھونکے تیز تر خنجر کی دھار
ہاتھ اُٹھا کر کہہ رہے ہیں موت اے ذاتِ کریم!
آنے والے کا غرورِ قدس بھی تھرّا گیا
آہ یہ تو اس کے بچے ہیں جو کل شب چل بسا
بھینٹ زرداری کی چڑھ کر اُٹھ گیا ہے دہر سے
جس کی کوڑوں سے اُڑائیں ظالموں نے دھجّیاں
دیکھتے ہی دیکھتے آنکھوں سے وہ غائب ہُوا
آسماں کی نورِ دیدہ بن گئی وہ روحِ پاک
منتظر سرمایہ داری جن کے کھانے کے لئے

تیرے منظورِ نظر خونخوار کتوں کے لئے — پیش کرتے ہیں لہو دل کا جگر کے لوتھڑے
کیا اسی پر منعموں کی ٹھوکریں سہتے ہیں یہ — کیا اسی پر رحمتوں کے منتظر رہتے ہیں یہ
کیا اسی حسنِ کرم پر تجھ کو کہتے ہیں کریم — کیا اسی بل پر دکھاتا ہے انہیں نارِ جحیم
کیا یہی خونخوار ہیں نازو نعم کے واسطے — اور یہ مزدور ہر ظلم و ستم کے واسطے
ہیں سنہری قصر ہیں اربابِ زر جلوہ فگن — اور یہ مزدور بیچارے اسیرِ صد محن
چھینتے ہیں کس لئے مزدور کے منہ سے طعام — کس لئے تو نے بنایا ہے انہیں ذی احتشام
کوئی حد بھی ہے یہ آخر تا بہ کے رنج و محن — سڑ رہی ہے جھونپڑی میں دیکھ نعشِ بے کفن
آہ دنیا میں نہیں ہمدم کوئی ایسا کہ جو — اشکباری میں یتیموں کا شریکِ حال ہو
آہ وقف ہے کسی فطرت کا رنگیں شاہکار — حیف اے خونخوار دنیا حیف اے سرمایہ دار
اب کوئی دن میں چھلکنے کو ہے جامِ اضطراب — دیکھنے والی ہے چشمِ شوق دورِ انقلاب

(۴)

شاعرِ آتش نوا کا نالۂ بے اختیار — عرش پر پہنچا ہوا کے دوش پر ہو کر سوار
لرزہ بر اندام تھے کروبیاں سن کر صدا — قاضی الحاجات خود حیران تھا یہ کیا ہوا
زلزلہ ہے آگ کا شعلہ ہے یا طوفان ہے — ذرّے ذرّے سے عیاں اک حشر کا سامان ہے
بڑھ گئی حد سے پریشانی فلک والوں میں جب — لے کے انگڑائی اثر بڑھنے لگا نالوں میں جب
عرض کی جھک کر ہوا نے خالقِ ارض و سما — ہے یہ اک اہلِ زمیں مظلوم بندے کی صدا
رات دن سیلِ حوادث میں بہا کرتا ہے جو — داستاں مزدورِ بے کس کی کہا کرتا ہے جو
سن کے قسّامِ ازل نے جوش میں آ کر کہا — اے فلک کے رہنے والو ہوش میں آؤ ذرا
آہ اک ناپاک انساں کی مرے افلاک پر — حیف ہے صد حیف ایسی جرأتِ بے باک پر
کھینچ کر لاؤ زمیں سے بے ادب کو تم یہاں — تا کہ ٹوٹے اس کی جرأت کا طلسمِ بیکراں
گونج اٹھی آسماں پر اک صدائے جاں ربا — اور فلک سے اک فرشتہ جوش میں نازل ہوا

کیا خبر کب کام سے باپ ان کا واپس آئیگا
اور بلکتے بے کسوں کو پیار سے سمجھائے گا

(۲)

اے ہوا اے تیرگیٔ بخت اے پرغم فضا
جب سنبھالیں ہوش یہ معصوم دل نامِ خدا

ان سے کہنا کرگئی ہے یہ وصیت ماں تمہیں
اہلِ دولت نے ملایا خاکِ ذلت میں ہمیں

تم طلسم ان کا نہ توڑو گر تو جینا ہے فضول
نیند بھر سونا حرام اور کھانا پینا ہے فضول

ہاں اڑادو عیش کے متوالے انسانوں کی گرد
اور فلک سے باتیں کرنے والے ایوانوں کی گرد

زورِ بازو سے بدل دو گردشِ ایام کو
نوچ لو زربفت میں لپٹے ہوئے اجسام کو

چھین لو ان معصیت کاروں کی بینائی کا نور
توڑ کر رکھ دو زر و دولت کے بندوں کا غرور

بوٹیاں سرمایہ داری کی فضا میں چارسو
اڑ رہی ہوں اور ٹپکتا ہو ہواؤں سے لہو

مجھ کو خاکِ گور میں راحت ملے گی تب کہیں
ورنہ انگاروں کا بستر ہوگی تربت کی زمیں

ٹھوکروں سے سیم و زر کے بُت ملا دو خاک میں
تب مسرت کی چمک ہو دیدۂ نمناک میں

ہاں مٹا دو صفحۂ ہستی سے نامِ نابکار
ننگِ عالم ہے نہ رہنے پائے یہ سرمایہ دار

ہڈیاں جب تک چباؤ گے نہ زرداروں کی تم
گردنیں جب تک اڑاؤ گے نہ زرداروں کی تم

قبر میں تڑپا کرے گی میری روحِ غم شعار
چونک چونک اُٹھا کریں گی حسرتیں بے اختیار

کہنے پائی تھی یہیں تک وہ کہ شمعِ زندگی
موت کے مسموم جھونکوں سے اُلجھ کر رہ گئی

(۳)

اے خدا اے نعمتِ امن واماں کے مدعی
وسعتِ رحمت تری اے بندہ پرور ہے یہی

اے خدا بندہ نوازی کیا اسی کا نام ہے
بس یہی مزدور کی محنت کا کیا انعام ہے

کیا اسی پر تو ہے رحمان و رحیم دوجہاں
کیا اسی پر نام لیتے ہیں ترا خورد و کلاں

کیا یہی ہے تیری رزّاقی کی حدِّ اختتام
کیا یہیں پہ جوش کھاتا ہے غضب تیرا مدام

کیا اسی پر چھاؤں میں تاروں کی شب بھر غم نصیب
کیا اسی پر برف زا ٹھنڈی ہواؤں میں غریب

مزدور کی تصویر

چشمِ عبرت آ دکھاؤں میں تجھے وہ سرزمیں
چومتی ہے جس کی چوکھٹ کو فرشتوں کی جبیں

خشک ٹکڑا بھی جہاں مزدور کو حاصل نہیں
ہے لہو سے جس کے رنگیں اہلِ زر کی آستیں

محنت و اندوہ و غمِ شام و سحر جس کی غذا
جگمگاتا ہے پسینہ جن کے بجلی کی ضیا

جس کی ہے گاڑھی کمائی سود خواروں کے لئے
جس کی جانِ زار ہے سرمایہ داروں کے لئے

ابنِ آدم جس کے باعث صاحبِ توقیر ہے
جس کی محنت اہلِ زر کے واسطے اکسیر ہے

آہ لیکن اس کی ساری کلفتوں کا یہ مآل!
ننھے بچوں کو ملے نانِ شبینہ یہ محال

موسمِ سرما کی شب سہمی ہوئی ہے کائنات
سو رہا ہے خامشی کی گود میں سازِ حیات

تیرگی کا دور دورہ ہے فضا ویران ہے
اہلِ زر کے گھر میں لطف و عیش کا سامان ہے

جھونپڑوں میں فاقہ کش مزدور ہیں کھوئے ہوئے
یعنی اپنے ہی نصیبوں کی طرح سوئے ہوئے

اک جمیلہ جس کا شوہر گھر سے کوسوں دور ہے
اپنے بیکس لاڈلوں کو دیکھ کر رنجور ہے

چہرہ افسردہ تنِ نازک علالت کا شکار
دم لبوں پر اور آنکھوں میں کسی کا انتظار

مشعلِ راہِ عدم ہیں سینۂ بریاں کے داغ
ہچکیوں پر آرہا ہے زیست کا دھندلا چراغ

تابِ گویائی زباں میں گو نہیں، دل میں مگر
کہہ رہی ہے کون لیگا ان یتیموں کی خبر

آہ یہ نورِ نظر وجہِ قرارِ زندگی
جن کے اک ہلکے تبسم پر مدارِ زندگی

آہ یہ نورانی چہرے ماند پڑ جائیں گے جب
ٹھوکریں کھایا کرینگے راستوں میں روز و شب

سوتے سوتے خواب سے جب چونک اٹھینگے غریب
کون دیکھے گا انہیں اور کون سوئے گا قریب

کون ہوگا جو دھڑکتی چھاتیوں پر رات کو
رکھ کے سوئے مادرانہ شفقتوں سے ہات کو

کھیل کر آئیں گے یہ معصوم گھر میں جب کبھی
کس سے پوچھیں گے کہ کیا ابا نہیں آئے ابھی؟

فرصت

مجھے فرصت ملی گر کچھ دنوں نغمہ سرائی کی
تو مظلومی کی گردن کس طرح فرطِ تکبر سے
اکڑ کر خواجگی پر مسکراتی ہے بتا دوں گا
تبسم کھیلتا ہے کس طرح مغموم آنکھوں میں
یتیمی کس طرح تانیں اڑاتی ہے بتا دوں گا
بڑھاپے کی رگوں میں کس طرح مخمور راتوں کو
جوانی جھوم کر بنسی بجاتی ہے بتا دوں گا
غریبی اہلِ دولت کے کراہت خیز چہروں سے
لپک کر کس طرح پردے ہٹاتی ہے بتا دوں گا
سسکتی نازنینوں کے بسنتی روپ کے آگے
شفق کس طرح گردن کو جھکاتی ہے بتا دوں گا
مسرت کس طرح بیچارگی کے خشک ہونٹوں پر
تبسم کی خنک شمعیں جلاتی ہے بتا دوں گا
برستی انکھڑیوں والے حسینوں کی نظر دل کو
بھٹک کر کس طرح بے خود بناتی ہے بتا دوں گا
مجھے فرصت ملی گر کچھ دنوں نغمہ سرائی کی

جس کے آگے دم بخود ہو جائے فطرت کا شعار
الغرض لازم ہے اتنی نان جلنے کے لئے
ہو ضروری ناخدا جیسے سفینے کے لئے
اور ایماں نام ہے اُس قوت موہوم کا
چھینتی ہے جو غرورِ زندگی معصوم کا
جو بنا دیتی ہے انسانوں کو حد درجہ حقیر
بیچتے ہیں سیم و زر کے چند ٹکڑوں پر ضمیر
جو چھپا کر پیٹ کے بندوں کو اپنی آڑ میں
رات دن رکھتی ہے مزدوروں کے خوں کی تاڑ میں
جو بدل کر راہبر کا روپ دیتی ہے فریب
بن کے بجلی پھونکتی ہے دامن صبر و شکیب
جو بدل کر لیڈری کا معصیت آلود بھیس
بیچتی ہے مغربی زر دار کے ہاتھوں میں دیس
پھانستی ہے جو غریبوں کو خدا کے نام پر
چٹپٹے الفاظ کے دانے بچھا کر دام پر
چھین لے جو نوجوانوں سے جوانی کا خمار
سادہ لوحوں کو بنائے مولویت کا شکار
گردنوں کو جو جھکائے سیم و زر کے پاؤں میں
خونِ دہقاں سے نہائے ڈاڑھیوں کی چھاؤں میں
ایسے ایماں کو ہمارے دور سے لاکھوں سلام
ہو رہی ہے جس سے اپنی زندگانی تک حرام

———:•:()•:———

نان و ایمان

نان کی مضراب سے ہے وجد میں سازِ حیات
نان کی تنویر سے روشن ہے بزمِ کائنات
نان کی قوت سکھاتی ہے جوانی کو غرور
نان سے انسان کو آتا ہے جلنے کا شعور
نان دیتی ہے ہوا غیرت کی زرّیں آگ کو
رن کی جانب موڑتی ہے جرأتوں کی باگ کو
نان دیتی ہے سبق قوم و وطن کی چاہ کا
نان دیتی ہے پتہ انسانیت کی راہ کا
نان کی صہبا سے حاصل ہے جوانوں کو سرور
مسکرا کر آگ کے دریا کو کرتے ہیں عبور
نان سینوں کو عطا کرتی ہے ایسی زندگی
سنسناتی گولیوں کو جس سے ہو شرمندگی
نان سے ہوتی ہیں روشن مشعلیں ایثار کی
نان دیتی ہے جوانوں کو خودی تلوار کی
نان ہی رُخ پھیرتی ہے گردشِ افلاک کا
زندگی کے حادثوں کی جرأتِ بے باک کا
نان اعضا کو عطا کرتی ہے وہ سنگیں شباب
ہو چٹانوں کی صلابت جس کے آگے آب آب
نان دیتی ہے جوانوں کو وہ پُر شوکت وقار

مُنلا رہے گا خالقِ اکبر لیکن دل آزاری پر
دیکھ کے کیوں تو سوئے فلک اے بھوک کے مارے روتا ہے
بہرے کو آوازیں دینے سے حاصل کیا ہوتا ہے
بہرہ ہے رزّاقِ جہاں آواز نہ دے نادان نہ بن

اے قیدی اے دُکھیا قیدی زنداں کی ظلمت کے مکیں
فطرت تیری کتنی اجلی باطن تیرا کتنا حسیں
مست و جواں راتوں کو تو نے سجدوں میں برباد کیا
خانۂ دل میں اِک نادیدہ ہستی کو آباد کیا
ساون کی شاموں میں بھی ایمان رہا ہے ساتھ ترے
واعظ سا دیندار مگر پینے میں رہا ہے ساتھ مرے
اُف لیکن انجام ترا ہنستوں کو خون رلائے گا
جب تجھ کو بے جُرم و خطا کل دار پہ کھینچا جائے گا

یہ تو ایک کہاوت ہے "وہ کاٹتا ہے جو بوتا ہے"
بہرے کو آوازیں دینے سے حاصل کیا ہوتا ہے
بہرہ ہے رزّاقِ جہاں آواز نہ دے نادان نہ بن

رزّاقِ جہاں

اے لڑکی اے بھیگی پلکوں والی کیوں مغموم ہے تو
لنواری کلیوں کی لچکیلی ڈالی کیوں مغموم ہے تو
اُترا اُترا چہرہ ہے اور ہونٹ ہیں سوکھے سوکھے سے
اُجڑا اُجڑا جوبن ہے اور بال ہیں روکھے روکھے سے
کیسے ہیں یہ میلی اُنگلیوں میں تانبے کے سکّے سات
عصمت تیری بک گئی شاید آج کسی زردار کے ہات
پیٹ کی آگ بجھا دی آخر رزّاقِ دوعالم نے
سیدھی راہ دکھادی آخر رزّاقِ دوعالم نے
آہوں کا کیا اُس پہ اثر وہ لمبی تانے سوتا ہے
بہرے کو آوازیں دینے سے حاصل کیا ہوتا ہے
بہرہ ہے رزّاقِ جہاں آواز نہ دے نادان نہ بن
اے لڑکے اے بھولے بھالے لڑکے یوں مضطر نہ بنا
آنکھوں سے سیلاب بہاکر بیوہ ماں کا دل نہ دکھا
اک مدّت سے گھر میں تیرے بھوک نے ڈیرے ڈالے ہیں
آنتوں میں ہیں شعلے رقصاں اور ہونٹوں پہ نالے ہیں
قدرت سب کچھ دیکھ رہی ہے اور تڑپائے جاتی ہے
جھوم جھوم کر میٹھی لَے میں گانا گائے جاتی ہے
موت کو کوئی دم میں رحم آئے گا تیری ناداری پر

میں سوچتا تھا جدائی نہ تاکتی ہو ہمیں ۔۔۔ خدا کے ساتھ خدائی نہ تاکتی ہو ہمیں
جوانیاں نہ کہیں سسکیوں میں بٹ جائیں ۔۔۔ محبتوں کی حسیں ڈوریاں نہ کٹ جائیں
نہیں ملے ابھی جی بھر کے اور بچھڑ جائیں ۔۔۔ کہیں سماج کے ہاتھوں نہ ہم اجڑ جائیں
وہ رات بیت گئی اور بھی کٹیں راتیں ۔۔۔ مگر وہ رات عطا کر گئی جو برساتیں
برستی رہتی ہیں آنکھیں مگر وہ رات کہاں ۔۔۔ تمہارے ہونے سے جو بات تھی وہ بات کہاں
یہی خیال کہ بدنام تو نہ ہو جائے ۔۔۔ مرے لئے کہیں بے آبرو نہ ہو جائے
مجھے وطن کی حسیں وادیوں سے لے آیا ۔۔۔ شباب و شعر کی آبادیوں سے لے آیا
لہو کے گھونٹ شب و روز پی رہا ہوں میں ۔۔۔ یہاں اداس فضاؤں میں جی رہا ہوں میں
ہے دور دور فضاؤں میں غم کا راج یہاں ۔۔۔ نظر اٹھا نہیں سکتا مگر سماج یہاں
خزاں نصیب گلستاں میں آ رہی ہے بہار ۔۔۔ ہر ایک دل سے بغاوت کے اٹھ رہے ہیں شرار
شہنشہی کا گریباں ہے اور ہاتھ مرے ۔۔۔ نہیں میں خود ہی یہاں اور بھی ہیں ساتھ مرے
مرے گروہ میں مزدور بھی کسان بھی ہیں ۔۔۔ حوادثات سے کھیلے ہوئے جوان بھی ہیں
بھڑک رہی ہے مرے دل میں انتقام کی آگ ۔۔۔ رگوں میں رینگتے پھرتے ہیں اضطراب کے ناگ
یہ کھانستی ہوئی رسمیں یہ ہانپتا قانون ۔۔۔ یہ باغیوں کے ترانوں سے کانپتا قانون
یہ قید و بند یہ تقسیمِ کار کہنہ نظام ۔۔۔ ہے جس کے ہاتھ میں مدقوق زندگی کی زمام
اک انقلاب سے دوچار ہونیوالا ہے ۔۔۔ قضا کی گود میں سر رکھ کے سونیوالا ہے

گرے ہوؤں کو اٹھا کر فلک مقام کیا
ہمارے عشق نے وہ لاجواب کام کیا

حمیدہ مشرّف کے نام

مری حسین مشرّف وہ چاندنی راتیں
نظریں کروٹیں لیتی تھیں جب جواں باتیں

وہ ایک رات وہ بہکی ہوئی سرور فروش
فلک پہ چاند ستاروں کی شمعیں طور بدوش

وہ مست مست نظارے وہ نیلگوں دریا
جوانیوں میں اشارے وہ نیلگوں دریا

ہزار حشر اُٹھاتا ہوا شباب ترا
مچلتا، ناچتا، گاتا ہوا شباب ترا

مرے شباب سے کچھ اس طرح قریب ہوا
کہ جاگتے میں مجھے اونگھنا نصیب ہوا

کلی کلی نے تبسّم کیا فضا جاگی
شگفتہ ساز سنبھالے ہوئے ہوا جاگی

نشیلی لہروں نے بربط کے تار چھیڑ دیے
زمیں پہ بوندوں نے میٹھے ملار چھیڑ دیے

سرور بیز ہواؤں نے گیت برسائے
نہائے پانی میں کرنوں کے سیمگوں سائے

لرزتے ہونٹوں سے میں نے تمہارا نام لیا
قدم بڑھا کے تمہیں بازوؤں میں تھام لیا

دھڑک رہی تھی جوانی مچل رہا تھا شباب
مثالِ چشمۂ صحرا اُبل رہا تھا شباب

تمہارا سر مرے زانو کو گدگداتا تھا
تو آسماں مرے قدموں پہ سر جھکاتا تھا

وہ زیرِ لب کبھی سرگوشیاں جو ہوتی تھیں
تصوّرات میں کچھ پھول سے پروتی تھیں

تمہارے گیسوؤں سے کھیلتا تھا ہاتھ مرا
شراب ریز ہوا دے رہی تھی ساتھ مرا

نگاہ ملتے ہی لیکن چھلک پڑے آنسو
یکایک آنکھوں سے اپنی ڈھلک پڑے آنسو

کسی خیال کی گہرائیوں میں ڈوب گئے
مآلِ عشق کی رسوائیوں میں ڈوب گئے

اَن دیکھی پگڈنڈی ہے اور طوفانی اندھیارا

موڑوں سے بھرپور ہے رستہ ہر موڑ ایک خرابی
قدم قدم پر رنجیں دھوکے ڈگر ڈگر بے تابی
آشاؤں کی زندہ نعشیں؛ چلتا مست شرابی
ڈوب چلا ہے غم کے بادل میں جیون کا تارا
اَن دیکھی پگڈنڈی ہے اور طوفانی اندھیارا

بھوکی نظریں نکھرے جوبن پر جھکتی ہیں ایسے
ویرانے میں پردیسی کی نعش پہ چیلیں جیسے
یا سُندر جوگن کی تھالی پر تانبے کے پیسے
پاپ کی اگنی بھڑک اُٹھی ہے پاکر لوبھ سہارا
اَن دیکھی پگڈنڈی ہے اور طوفانی اندھیارا

آگ کی ندی بہتی ہے چلتے ہیں خون کے نالے
ڈسنے والی لہریں ہیں یا سم آلودہ بھالے
پڑے ہوئے ہیں اب تک قدرت کے ہونٹوں پر تالے
رعشہ ہاتھوں میں شل پاؤں سر پر بوجھ کا بھارا
اَن دیکھی پگڈنڈی ہے اور طوفانی اندھیارا

جی کہتا ہے اس پگڈنڈی کو ہموار بنا دوں
تاریکی کو روشن کردوں جلتے دیپ بجھا دوں
پستی کو دوں عرش کی رفعت عرش کو فرش بنادوں
خواب سے چونکے غافل انساں جاگے عالم سارا
اَن دیکھی پگڈنڈی ہے اور طوفانی اندھیارا

اضطراب

آسماں آگ اُگلتا ہے زمیں ہانپتی ہے
موت کی زلیست کے چہرے پہ نظر کانپتی ہے
بھوک بے باک نگاہوں سے ہمیں بھانپتی ہے
تم مگر میرے لئے عشق و وفا لائی ہو
بن کہے کیوں میری خلوت میں چلی آئی ہو

پونجیاں چاٹتی ہیں جھومتے کھیتوں کا لہُو
اشکِ خونیں سے ہیں لبریز خم و جام و سبُو
عصمتیں پیٹ نے کر رکھی ہیں وقفِ من و تُو
اور تم میرے خیالات پہ لہرائی ہو
بن کہے کیوں میری خلوت میں چلی آئی ہو

یہ سلگتے ہوئے آنسو یہ سسکتی آہیں
حسن کی گردنِ نازک میں ہوس کی باہیں
جھونپڑوں سے یہ محلات کو جاتی راہیں
اس سمے کیوں میرے جذبات پہ تم چھائی ہو
بن کہے کیوں میری خلوت میں چلی آئی ہو

زلفِ پیچاں ہے کہ زنجیر ہے زندانوں کی

عقائد

آدمی مجموعۂ اوہام ہے — نام کو ورنہ خدا کا نام ہے
مسجدیں ہیں دشمنِ ادراک و ہوش — میکدہ کیوں موردِ الزام ہے
پاک ہے سجدوں سے فطرت کی جبیں — بندگی کا زیست پر الزام ہے
چند سانسیں اور اک خوابِ طویل — نظمِ ہستی کس قدر ناکام ہے
وقت کے ماتھے پہ کس نے لکھ دیا — ابنِ آدم خوگرِ آلام ہے
پرسشِ غم اور بہ اندازِ ستم — شکریہ، پہلے سے کچھ آرام ہے
کتنے رنگیں دام ہیں ہر گام پر — گیسوؤں کا دام کیوں بدنام ہے

زندگی الطاف کیا ہے کچھ نہ پوچھ
ایک رومانِ الم انجام ہے

شجاعت

آتی ہے شجاعت کے قدم لینے کو شاہی
تاریخ کے اوراق یہ دیتے ہیں گواہی

آنکھوں کے چمن زار میں غیرت کا نشیمن
تیوریوں کی آغوش میں ہمت کا نشیمن

انگڑائیاں لیتا ہوا ہونٹوں پہ ترانہ
پیشانی پہ مرقوم شہادت کا فسانہ

شانوں کے ابھاروں میں دھڑکتے ہوئے بھونچال
دبتی ہوئی خودداری کے شاہیں کو پروبال

بھڑکاتی ہوئی وقت کی آغوش میں آگیں
تھامے ہوئے تاریخ کے رہوار کی باگیں

باہوں میں چھپائے ہوئے طوفان کی کروٹ
سینے میں سنبھالے ہوئے ایمان کی کروٹ

برساتی ہے انوار کے طوفان زمیں پر
رکھتی ہوئی قدموں کو ستاروں کی جبیں پر

قدموں میں سمیٹے ہوئے رفتارِ زمانہ
کس شانِ ادائے رنگیں کو شجاعت ہے روانہ

اندھیارا دم توڑ چکا اُٹھ جاگ
نِکلا سورج نندیا کو اب تیاگ، مورکھ اب تو جاگ

موت کی زد میں رہنے والے جیون لے کر آئے
دنیا کے ان داتا نِکلے دنیا بھر پہ چھائے
بھونچالوں کا بھیس بدل کر دولت سے ٹکرائے
شریانوں میں لے کر اُٹھے بھڑ بھڑ کرتی آگ
اندھیارا دم توڑ چکا اُٹھ جاگ
نکلا سورج نندیا کو اب تیاگ، مورکھ اب تو جاگ

کوئی دن میں غیروں کے سر ہوں گے اپنے پاؤں
شہروں کی ہلچل پہ چھا جائیں گے اُجڑے گاؤں
بھوکے دہقانوں کی ٹولی اور اکتا کی چھاؤں
وادی وادی گونج اُٹھے گا ایک رسیلا راگ
اندھیارا دم توڑ چکا، اُٹھ جاگ
نکلا سورج نندیا کو اب تیاگ، مورکھ اب تو جاگ

کانپ اُٹھے آکاش تو اسی ہر ایواں تھرّایا
طوفانوں کی سانسیں اُکھڑیں بنی بھکارن مایا
ہردے ہردے بھڑک اُٹھی ہے اِک اَن دیکھی آگ
اندھیارا دم توڑ چکا اُٹھ جاگ
نِکلا سورج نندیا کو اب تیاگ، مورکھ اب تو جاگ۔

ڈوب گیا اپنے اندھیارے میں پچھم اُجیارا
بہہ نکلی امرت شالہ سے زہریلی اِک دھارا
طوفانوں کی زد میں آیا اپنا کھیون ہارا
مٹّی میں تبدیل ہوا سونا، تاجر کے بھاگ
اندھیارا دم توڑ چکا اٹھ جاگ
نِکلا سورج نندیا کو اب تیاگ، مورکھ اب تو جاگ

بھور بھئی اپنی نگری میں رین سمندر پار
کالی مٹّی نے لی کروٹ جاگ اٹھا سنسار
بھوکوں نے کرنا سیکھا اپنے دُکھ کا پرچار
پربت کے بیٹوں نے چھیڑا آزادی کا راگ

بھور

پورب سے اگنی دیوی نے دیپک راگ الاپا
کنگلوں نے مایا نگری پر بل کر مارا چھاپا
نربل کرنوں نے اندھیارے کی گردن کو ناپا
باہنی ہیں چپ سادھ کے سوئے اب تو بھورے ناگ
اندھیارا دم توڑ چکا اُٹھ جاگ
نکلا سورج نندیا کو اب تیاگ، مورکھ اب تو جاگ

مسکاتی ہیں بیٹے کی میّت پر اب ماتائیں
میدانوں میں مرنے کی ہر من میں ہیں آشائیں
چھائی ہیں آکاش پہ دہکی سُرخ گھٹائیں
آزادی کے نام پر اُڑتا ہے کوٹھے سے کاگ
اندھیارا دم توڑ چکا اُٹھ جاگ
نِکلا سورج نندیا کو اب تیاگ، مُورکھ اب تو جاگ

دولت سے افلاس کا مارا انساں یوں ٹکرایا

اے جواں اے اعتقادوں کے سلاسل کے اسیر
کاش چہرے سے اُلٹ سکتا ردا تیرا ضمیر

شکر و شکرانے کا دے دے کر بہر ساعت خراج
تیرے جیسوں ہی نے خالق کا بگاڑا ہے مزاج

کس طرح مانوں میں ایسے قاضیٔ حاجات کو
خونِ بےکس کی حنا سے جو سجائے ہات کو

اس لئے مانوں کہ میری نوجوانی کی بہار
ہو گئی اس کے اشارے پر خزاں سے ہمکنار؟

اس لئے مانوں کہ میرا زندگی بھر کا رفیق
مونس و غمخوار و ہمدرد و بہی خواہ و شفیق

بے کسی کے زرد ہونٹوں کا پیالہ بن گیا
موت کے خونخوار جبڑوں کا نوالہ بن گیا

لیکن اس پر بھی میں شکر اس کا بجالاتی رہی
دل کے زخموں پر ستم کی برچھیاں کھاتی رہی

آج لیکن ہو گئی جور و ستم کی انتہا
آہ میرا لال میری زندگی کا آسرا

پاس ہی لیٹا ہوا تھا اوڑھ کر چادر مری
جس مکاں میں کر رہی تھی کام میں قسمت جلی

اینٹ دیتے وقت میرا ہاتھ کچھ تھرا گیا
زندگانی کی امیدوں پر اندھیرا چھا گیا

اینٹ بن کر موت کی بجلی گری معصوم پہ
بیکسی کی سُرخ آندھی چھا گئی مقسوم پہ

سُن کے رودادِ ستم رنگِ حقیقت کُھل گیا
دل بغاوت پر خدائے دوجہاں کی تُل گیا

بغاوت

اک جمیلہ مانیٔ قدرت کا لاثانی کمال — لب پہ شکوہ اور دل میں گھر اُجڑنے کا خیال
عسرتوں کی آگ شریانوں میں سلگاتی ہوئی — زندگی کی ہر روش پہ ٹھوکریں کھاتی ہوئی
موت کے جانسوز سورج کی کڑکتی دھوپ میں — رحمتوں کو دیکھ کر خونخواریوں کے رُوپ میں
کہہ رہی تھی اے خدا تیرا طلسمِ بیکراں — توڑتے ہیں دیکھ کیسے بھُوک کے مارے جواں
کس طرح تیری ربُوبیّت کا رعبِ بے پناہ — چھینتے ہیں آہنی ہاتھوں سے با حالِ تباہ
کس طرح تیری خدائی کی ردائے زرنگار — بے نوا مزدور کرتے ہیں جھپٹ کر تار تار
کس طرح تیرے نظامِ سیم و زر کی آبرُو — تھوکتی ہے دیکھ کر افلاس زادوں کو لہُو

حد سے جب بڑھنے لگا مزدور بیوہ کا عتاب — تو کیا یوں اس سے میں نے جوش میں آکر خطاب
ہوش میں آ ہوش میں اے مفلسی کی شاہکار! — راکھ کر دیں گے تجھے قہرِ الٰہی کے شرار
اس شہِ کون و مکاں کی شان میں گستاخیاں — جس کے ہاتھوں میں نظامِ کائناتِ دو جہاں
روزِ محشر جس کے اک ہلکے غضب کا نام ہے — جس کے ہاتھوں میں قضا کی تلخ مے کا جام ہے
سن کے گرجی اور گرج کر اس طرح کہنے لگی — گفتگو کے تیز رو دھارے میں یوں بہنے لگی

شریانوں میں دوڑ رہے ہیں خونی تقریروں کے فقرے
ابھرے شانوں والے دہقاں شہروں میں چنگھاڑ رہے ہیں
زرداری کے سینے پر افلاس کا پرچم گاڑ رہے ہیں
دوشیزائیں بک نہ سکیں گی عصمت اب نیلام نہ ہوگی
بھوکی بیواؤں کی عزّت زرداروں پر عام نہ ہوگی
کالی آنکھیں نیلی آنکھوں کے آگے اب جُھک نہ سکیں گی
سرمایہ کی سانسوں سے مزدور کی سانسیں رُک نہ سکیں گی
مزدوروں کے سر پر اینٹوں کو ترجیح نہ دی جائے گی
اُبھرے شانوں چوڑے سینوں کی توہین نہ کی جائے گی
پتلے ہونٹوں لمبی آنکھوں کا اب سے بیوپار نہ ہوگا
کاغذ کے ٹکڑوں سے اچھا عُسرت کا بیمار نہ ہوگا
باتوں پر اب قید نہ ہوگی لب سینے کا حکم نہ ہوگا
بھورے رنگ کی موت کے سائے میں جینے کا حکم نہ ہوگا
آج سے جیون اپنا ہوگا اپنا دن اور اپنی راتیں
میٹھی بولی مست ترانے اُف تم نغمے سنار باتیں

اپنے دن اور اپنی راتیں

خونیں ہے آکاش کی رنگت دھرتی تھر تھر کانپ رہی ہے
دولت کی دیوی راہوں میں سینہ پکڑے ہانپ رہی ہے
بندوقیں کاندھوں پر رکھ کر باغی ہر سُو گھوم رہے ہیں
اونچے اونچے میناروں پر سبز پھریرے جھوم رہے ہیں
چاروں جانب پھیل رہا ہے خون کے فوّاروں کا منظر
خون کے فوّاروں کا منظر پیلے انگاروں کا منظر
آگ کے شعلے خون کے چھینٹے تیر رہے ہیں سرخ فضا میں
چیخوں کا طوفان بپا ہے بھڑ بھڑ کرتی گرم ہوا میں
جھونپڑیوں نے اونچے ایوانوں کی گردن توڑ کے رکھدی
مظلوموں نے ظالم انسانوں کی گردن توڑ کے رکھدی
بھوک کے ماروں کی رگ رگ آگ کے طوفاں جاگ اُٹھے ہیں
فطرت جن پر نازاں ہے وہ کامل انساں جاگ اُٹھے ہیں
مزدوروں کی آنکھوں میں ہیں کڑوی تحریروں کے فقرے

ماغ بلی

دو موڑ

لب ترے چاند کی گاتی ہوئی رسیلیں قاشیں
تیری آنکھوں میں ہے جاگے ہوئے سپنوں کا شباب
مضطرب ہے ترے انفاس میں لچکیلی شمیم
تری انگڑائی میں بے تاب ہیں میخانے چند
ایک مدہوش ترنم تری آواز میں ہے
مسکراہٹ پہ تڑپتی ہوئی کرنوں کا ہجوم
ریشمیں، گول، حسیں، نرم، گلابی باہیں
یہ سراپا یہ شعاعوں کا مجسم ہونا
سرخ رخسار پہ زلفوں کی گھٹا کیا کہنا
کتنے لمبے تیری پلکوں کے گھنے سائے ہیں

اُف مگر بھوک کی روندی ہوئی زندہ لاشیں
آہ بازار میں بکتی ہوئی عصمت کی شراب
ذہنِ انساں میں ہیں بیدار ابھی خلد و جحیم
اپنا ایمان ہے اسلاف کے افسانے چند
اپنا انجام ابھی منزلِ آغاز میں ہے
کھا گئے فطرتِ آزاد کو قسمت کے نجوم
ہم پہ مسدود ہیں جینے کی ابھی تک راہیں
آہ باقی ہیں ابھی داغِ نقاہت دھونا
سانس لینے کو میسر ہے ہوا کیا کہنا
ہم کہاں ظلم کی وادی میں اُتر آئے ہیں

تُو اُدھر نرم و حسیں گیت بنی جاتی ہے
اپنی حالت پہ اِدھر مجھ کو ہنسی آتی ہے

آپ اور ہم

آپ اگر وقت کی آواز نہیں سُن سکتے
ہم بھی اب اپنے لئے جال نہیں بُن سکتے

آپ اگر نُطق کو تالوں سے ڈرا سکتے ہیں
ہم بھی ماحول کو خونخوار بنا سکتے ہیں

آپ اگر لاشوں کے زینے پہ قدم رکھتے ہیں
ہم بھی ہر کھولتی عظمت کا لہو چکھتے ہیں

مصلحت آپ کی غیرت پہ اگر بھاری ہے
اپنے اوسان پہ بھی ایک فسوں طاری ہے

آپ تقسیم کو ہموار نہیں کر سکتے
ندیاں آگ کی ہم پار نہیں کر سکتے

خون عصمت کا مراتب کی رگوں میں رقصاں
اور قلم پہروں کی آغوش میں پیہم لرزاں

اپنی مجروح حمیّت کا ہے احساس ہمیں
یہ سِسکتا ہُوا ماحول نہیں راس ہمیں

دیہات

زمیں جب کھیتیوں میں پیٹ کا ایندھن اگلتی ہے
کھنکتی پیٹیوں میں اِشتہا کی آگ جلتی ہے
سحر دم کونپلوں پر اوس کے موتی تھرکتے ہیں
تو خونی پوٹلیوں میں سُود کے بچھو سرکتے ہیں
کوئی نوخیز چرواہا کبھی جب گیت گاتا ہے
حضورِ سیم و زر سے قتل کا انعام پاتا ہے
کسانوں کی گلابی بیٹیاں پنگھٹ پہ آتی ہیں
تو آقاؤں کے بھُوکے قہقہوں میں ڈوب جاتی ہیں
لہُو دہقاں کا پھُولوں کی رگوں میں مُسکراتا ہے
تو سرمایہ خزاں بن کر چمن میں پھیل جاتا ہے
دُکھے دل رات کو چوپال پہ آپس میں ملتے ہیں
تو زہری اژدہے قانون کی آنکھوں میں پلتے ہیں
برستے موسموں میں کھیتیاں جب لہلہاتی ہیں
تعفن سے بھری توندوں کی بھُوکیں جاگ جاتی ہیں
کوئی قانون زادہ کاغذی طاعون لاتا ہے
تو ہر بیمار سے ناموس کی سوغات پاتا ہے
زمانہ جن پہ ہنستا قیصریت جن کو ڈستی ہے
یہ قبرستان اُن جکڑے ہوئے شیروں کی بستی ہے

ہل کی ہتّھی پہ نظر گاڑے ہوئے
سوچتا ہے اک کسان

جو لہو مجبوریوں کا پی گیا   موت نے مارا اُسے وہ جی گیا
جو حوادث پر مسلّط ہو گیا   غم کے کانٹوں پر مچل کر سو گیا
ظلم کی آندھی چلی تو ڈٹ گیا   خم نہ گردن میں پڑا اور کٹ گیا
غیرتوں کا پاسبان

ہل کی ہتّھی پہ نظر گاڑے ہوئے
سوچتا ہے اک کسان

سوچتا ہے کس قدر مجبور ہوں   زندہ رہ کر زندگی سے دُور ہوں
خامشی میری مگر طوفان ہے   میرے سینے میں بپا ہیجان ہے
پیش گوئی ہے یہ اک بھونچال کی   یہ علامت ہے کسی جنجال کی
پھٹ پڑے گا آسمان

ہل کی ہتّھی پہ نظر گاڑے ہوئے
سوچتا ہے اک کسان

سُرخ ہونٹوں پہ تبسّم کی بہار نیچی نظروں میں فسانے بے قرار
اُدھ کھلتے دل جاگتی رعنائیاں گنگناتی جھومتی انگڑائیاں

جس کے دم سے ہیں جوان
ہل کی ہتّھی پر نظر گاڑے ہوئے
سوچتا ہے اک کسان

خون جس کا غازۂ لیل و نہار جس کی محنت سے وقارِ شہریار
جس کے بیلوں کا پسینہ سیم و زر جس کے کھیتوں میں اُگیں لعل و گہر
جس کی مٹھی میں حیاتِ مُلک و قوم جس کی ہستی کائناتِ ملک و قوم

وہ جیئے بے آب و نان؟
ہل کی ہتّھی پر نظر گاڑے ہوئے
سوچتا ہے اک کسان

ہل قلم ہے کاتبِ تقدیر کا کھیت نقشہ زیست کی تصویر کا
نرم رو ہریالیاں ہیں مستِ خواب جانفزا منظر اُگلتے ہیں شباب
خلد در دامن ہیں سادہ نکہتیں میکدے برسا رہی ہیں نزہتیں

اور بھوکا ہے کسان

کسان

آرزوؤں کی کمر جُھکتی ہوئی سانس چلتی ہے مگر رُکتی ہوئی
تیرہ و تاریک سائے آس پاس حال مرجھایا ہُوا ماضی اُداس
غم کا مرکز آرزوؤں کا مزار پیٹھ پر لادے ہوئے نسلوں کا بار

ایک بوڑھا نوجوان
ہل کی ہتّھی پر نظر گاڑے ہوئے
سوچتا ہے اک کسان

خامشی اک مضطرب فریاد ہے مسکراہٹ ظلم کی رُوداد ہے
ہونکتے سینے میں کچھ چنگاریاں غیر کی بخشی ہوئی بیماریاں
جبر کی زنجیر جس کے پاؤں میں پل کے نکلا سُود جس کی چھاؤں میں

بن چکا جو داستان
ہل کی ہتّھی پر نظر گاڑے ہوئے
سوچتا ہے اک کسان

مست آنکھوں میں بہاروں کا ہجوم بولتے گاتے نظاروں کا ہجوم

داغ بیل

سُندر اور شرمیلی دھرتی کے ہونٹوں پر چیخیں کانپیں
لالچ کی بیاکل دوڑوں میں پیٹ لتائیں تھک کر ہانپیں
مذہب کی اندھیاری اُٹھی شعلوں کی مالائیں لے کر
شہروں کو شمشان بنانے کی من میں آشائیں لے کر
کل رُوپوں نے توڑ کے رکھدی سُندرتا کی سُندر تھالی
بھیڑوں کی سب رکھوالوں نے بھیڑیے بنکر کی رکھوالی
لاشوں کی سیڑھی سے ہو کر اُونچائی کی گود میں پہنچے
اُونچے ہونے والے گویا گہرائی کی گود میں پہنچے
آشاؤں کے سورج راہوں میں اجیارا بن کر پھیلے
ظلم کے بادل لیکن دھرتی پر اندھیارا بن کر پھیلے
پُورب کے بیٹوں نے جیون کی دیوی کو پتھر مارے
اب ہیں مانا پچھّم والو! پچھم جیتا اور ہم ہارے

ہار

پچّھم نے پُورب کے اندھے سُورج کو بخشا اُجیارا
ڈگمگ ڈگمگ کرتی نیّا کو سونپا مضبوط کنارا
دیکھ سمے کو اِک رنگے سہ رنگے پرچم جوش میں آئے
کرودھ کپٹ کے خونی طوفاں نیند سے چونکے ہوش میں آئے
تسبیحوں اور مالاؤں کی دُنیاؤں میں بھونچال آیا
مندر سے مسجد ٹکرائی مسجد سے مندر ٹکرایا
اِکتا کی ارتھی کو لے کر کاندھوں پر نکلے ہمسائے
اپنوں نے اپنوں کی لاشوں سے جنگل میں شہر بسائے
من میں لیکر کرودھ کی اگنی ہونٹوں پر زہریلی بولی
انسانوں نے مِل کر کھیلی انسانوں کے خون سے ہولی

دُعا

سُنہرے گال خراشوں کا درد سہتے ہیں
گھنیری پلکوں میں اشکوں کے رقص بہتے ہیں

کھنک کے شور میں عصمت کی سانس ٹوٹتی ہے
گہن کے نام سے کِرنوں کی نبض چھُوٹتی ہے

بہاریں سُود کی خوراک بنتی رہتی ہیں
فضائیں ظلم کے طوفان جنتی رہتی ہیں

اُجالے ظُلمتوں کی آندھیاں اُگلتے ہیں
ستارے تیرگی کی وادیوں میں پلتے ہیں

نشیلے لب ہیں تبسم کی ضو سے بیگانہ
نگارِ ناز ہیں رقصاں غموں کا افسانہ

بڑھاپا اُٹھتی جوانی کا خُون پیتا ہے
ہوس کا ناگ اسی کے سہارے جیتا ہے

کھنکتی بیٹیوں کی سُرخ سُرخ اولادیں
بنی ہوئی ہیں کسانوں کے لب پہ فریادیں

تجوریوں کی دباؤں نے کھیت چاٹ لئے
ٹھنک ٹھنک کی صداؤں نے کھیت چاٹ لئے

بہار زردیوں کی چادروں میں لپٹی ہے
چمن کی سبز قبا تھیلیوں میں لپٹی ہے

مگر لبوں پہ دعائیں تھرک رہی ہیں ابھی
یہ مست ناگنیں پیہم سرک رہی ہیں ابھی

دُعا اگرچہ حقیقت میں ایک دھوکا ہے
مگر دعاؤں کو اب تک کسی نے روکا ہے؟

جو چھپا کر پیٹ کے بندوں کو اپنی آڑ میں ‏ ‏ ‏ رات دن رکھتی ہے مزدوروں کے خوں کی تاڑ میں
جو پہن کر لیڈری کا معصیت آلودہ لباس ‏ ‏ ‏ بیچتی ہے مغربی زردار کے ہاتھوں میں دیس
گردنوں کو جو جھکائے سیم و زر کے پاؤں میں ‏ ‏ ‏ خونِ دہقاں سے نہائے ڈاڑھیوں کی چھاؤں میں
پھانستی ہے جو غریبوں کو خدا کے نام پر
چٹپٹے الفاظ کے دانے بچھا کر دام پر

الطاف کی شاعری کھاتے پیتے متوسط طبقہ اور امراء کے لئے ہرگز مفید نہیں۔ اسمیں گل و بلبل کے قصے، عیش و نشاط کی طربناکیاں ہجر و وصال کی پرلطف و رنگین داستانیں بہت کم ہیں۔ الغرض اسبابِ نشاط کی جنسی تسلی کا کوئی سامان نہیں۔ ہاں الطاف کی شاعری میں مزدوروں کسانوں کی تکالیف کا احساس شدت کے ساتھ موجود ہے۔ اس کے نغموں میں مظلوموں کی **حمایت** کا چشمہ ابل رہا ہے۔ اور اس کے شباب کی سرمستیاں اور رعنایاں وطنی جذبات کی لہروں کے ریلے میں مدغم ہوگئی ہیں۔ وہ دورِ جدید کا شاعر ہے۔ اور ہنگامہ خیزیوں کا علمبردار ——!

(ت۔ا)

کس طرح مانوں میں اپنے قاضیٔ حاجات کو　　خونِ بیکس کی حنا ہے جو سجائے ہات کو

اس لئے مانوں کہ میری نوجوانی کی بہار　　دم زدن میں اس نے کر دی ہے خزاں سے ہمکنار
اس لئے مانوں کہ میری زندگی بھر کا رفیق　　مونس و غم خوار و ہمدرد و بہی خواہ و شفیق

بیکسی کے زرد ہونٹوں کا پیالہ بن گیا
موت کے خونخوار جبڑوں کا نوالہ بن گیا

یا پھر جب کثرتِ آلام سے تھک جاتا ہے۔ اور شدتِ احساس اور معاشی مصائب کا انبوہِ عظیم اس کی جان پر بھاری ہو جاتا ہے۔ تو اپنی مجبوریوں اور ناکامیوں کو مئے باقی کی تلخیوں میں گم کرنا چاہتا ہے۔

اس خراب آباد میں کچھ روز جینے کیلئے　　دوست ہر خود دار ہے مجبور پینے کے لئے
الٰہی! گر مجھے اس ملک میں کچھ روز جینا ہے　　تو میری قوتِ احساس مردہ ہو کے رہ جائے

دلِ خود دار بارِ ذلتِ افلاس سہہ جائے
جبھی میں رہ سکوں گا شاد محکوموں کی بستی میں

لیکن ہر سیاست عرصہ تک قائم نہیں رہتی۔

الطاف کے کلام میں سوز اور درد ہے۔ اور جوش اور ولولہ لیکن اِن جذبات کی وسعت محبت تک ہی محدود نہیں۔ اُس نے خود رہنے کے لئے محبت کا دائرہ وسیع کر لیا ہے: بجائے ایک خیال یا اعلیٰ محبوب کے اسے عوام سے محبت ہے۔ وہ ایک پھول سے محبت نہیں کرتا۔ بلکہ سارے چمن سے اُسے ایک پھول کے مرجھانے سے افسوس نہیں ہوتا۔ اُسے افسوس ہے تو یہ کہ سارے چمن پر خزاں چھا گئی ہے۔ اسی خیر نے اُسے موجودہ نظام سے اس قدر متنفر کر دیا ہے۔ "نان و ایمان" میری رائے میں اس نفرت کو نہایت واضح طور پر اور سائینٹفک نقطۂ نگاہ سے ... ... پیش کرتی ہے۔ اور اس نظم کو میں شاعر کا شاہکار سمجھتا ہوں۔ جو لوگ مذہبیت کی آڑ میں لوگوں کو اُلّو بناتے ہیں۔ اُن کی مذہبیت پر طنز کے تیر و نشتر چبھوتے ہیں ؎

اور ایماں نام ہے اس قوتِ موہوم کا　　چھینتی ہے جو متاعِ زندگیٔ معصوم کا

گاتے ہیں۔ اور اسی طرح بالواسطہ یا بلا واسطہ طور پر اپنے آپ کو ایک خاص جماعت کا حامی بنا لیتے ہیں۔ الطاف نے جماعتی امتیاز کو نہایت اچھی طرح سے پہچان لیا ہے۔ اور یہی پہچان اُسے مجبور کئے دیتی ہے۔ کہ وہ اپنی تمام تر تخلیقی قوتیں گل و بلبل کی بے سر و پا رجعتی چنگیزیوں کو عیاں کرنے میں صرف کر دے۔

ہوش میں آ تو ڈر کر رکھ دے غلامی کی کمند
ڈال آزادی کے میدان میں ترقی کا سمند
آ بدل دیں اُٹھ کے اپنوں کی غلامانہ روش
آ کچل دیں زر کے بندوں کو کہ مٹ جائے خلش
آ کہ سفاکانہ فطرت ہی کو کر دیں ختم آج
آ کہ دنیا سے مٹا ڈالیں جفاؤں کا رواج

انقلابی شاعری کا یہ سیلاب عظیم یقیناً سرمایہ پرستوں کو اور اُن کے حواریوں کو خوش نہیں کر سکتا۔ الطاف کی شاعری سے اس قسم کی توقع بے سود ہے۔ وہ دھوکا دینا نہیں جانتا۔ ان شاعروں کی طرح جو عموماً اپنے کلام میں موت کی مساوات کا راگ گاتے ہیں۔ "دیکھئے نا صاحب کیا ہوا۔ اگر اس دنیا میں امیر اور غریب اور ظالم اور مظلوم ہیں۔ آخر بے چارہ سرمایہ دار بھی انسان ہے۔ اُسے بھی ایک دن موت آئے گی۔ اور قبر میں اسے چھ فٹ سے زیادہ جگہ نہیں مل سکتی۔ یوں بھی اگر ایک حمام میں ایک امیر اور غریب کو اکٹھے کھڑا کر کے ننگا کر دیا جائے۔ تو دونوں میں کوئی امتیاز نہ دکھائی دے گا۔ بس ثابت ہوا کہ سب انسان بھائی بھائی ہیں"۔ سبحان اللہ کیا منطق ہے۔ کیا عجیب فلسفہ ہے! اور پھر لطف یہ کہ بعض لوگ سمجھتے ہیں۔ کہ واقعی اسی قسم کی باتوں سے غریب لوگوں کا دل بہلایا جا سکتا ہے۔ اور شاعری سے بھی افیون کا کام لیا جا سکتا ہے۔ لیکن الطاف ایسی افیونی شاعری نہیں چاہتا۔ وہ موت کی مساوات کا قائل نہیں۔ وہ زندگی میں مساوات دیکھنا چاہتا ہے۔ وہ زندگی جہاں ؎

خشک ٹکڑا بھی جہاں مزدور کو حاصل نہیں
ہے لہو سے جس کے رنگیں اہل زر کی آتش
محنت و اندوہ غم شام و سحر جس کی غذا
جگمگاتا ہے پسینہ بن کے بجلی کی ضیا
جس کی ہے گاڑھی کمائی سود خواروں کیلئے
جس کی جان زار ہے سرمایہ داروں کے لئے

وہ اس زندگی میں مساوات کا قائل ہے۔ قبر میں نہیں۔ اور جب اپنے ارادوں کو عملی جامہ پہنتے ہوئے نہیں دیکھتا۔ تو چیخ اٹھتا ہے ؎

تسکین نہیں دے سکتی۔ ہاں دھوکا ضرور دے سکتی ہے۔ مثلاً جب کوئی شاعر کہتا ہے ؎

یہ دُنیا بہتا پانی ہے ٭ یہ مایا آنی جانی ہے

تو میں صاف پہچان جاتا ہوں۔ کہ یہ شاعر رجعت پسند ہے۔ نادانستہ طور پر ہی سہی لیکن یہ غریب لوگوں کی توجہ ان کے معاشی مسایل سے ہٹا کر محض چیڑی چیڑی دور از کار باتوں سے ان کا جی بہلانا چاہتا ہے۔ اور اس طرح سرمایہ داری کے ہاتھ مضبوط کر رہا ہے۔ بخلاف اس کے جب الطاف غیظ و غضب میں آکر کہتا ہے

وطن کے نام پہ سب کچھ نثار کرتا ہوا
میں اپنے ملک کو وقفِ بہار کرتا ہوا
خوشی سے جھومتا گاتا گزر جاؤں گا
مثالِ ابر زمانے پہ گھر کے چھاؤں گا

جو ہنی مرد کو پکارے گا میرا پیارا وطن

اور

پھر دیارِ حریت آباد کرنے کیلیے
جھوم کر اُٹھو وطن آزاد کرنے کیلیے
ہر تہی داماں شکوہ خواجگی کا ہو جواب
ہر جوانی کو عطا ہو خضر کا رنگین شباب

ذرّے ذرّے کی زباں پر ہو صدائے انقلاب

مغربی زردار کو ناشاد کرنے کیلیے
جھوم کر اُٹھو وطن آزاد کرنے کیلیے

تو صاف پتہ چل جاتا ہے۔ کہ الطاف ادب میں سامراج پسندوں کی مخالف سمت میں کھڑا ہے۔ اس کے جذبات کی ہیجانی کا ایک خاص رُخ ہے۔ اور اس کے سرفروش جذبات میں وطنیت اور مزدور کی محبت جھانک کر عوام الناس کو پیغامِ عمل دے رہی ہے ؎

نوجوانو تم کو اپنی زندگی کا واسطہ
بے بسی کا واسطہ بیچارگی کا واسطہ
واسطہ ناکتخداؤں کے پھٹے ملبوس کا
واسطہ افلاس کے روندے ہوئے ناموس کا
واسطہ اُن کا کہ فاقوں کی بدولت جو غریب
ہو رہے ہیں موت کے خونخوار جبڑوں کے قریب

برچھیوں سے قیصریت کے جگر کو چیر کر
بھوک کے مارے ہوؤں کی آبرو کی لو خبر

الطاف اُن شاعروں سے کس قدر مختلف ہے جو ہر مصرعے میں انسانی اخوّت اور مساوات کے راگ

حقیقت صرف اتنی ہے۔ کہ شکسپیئر الزبتھی زندگی کی ترجمانی کرتا ہے۔ اُس زمانے کی کہ جب انگریزی معاشی نظام کی کایا پلٹ ہو رہی تھی۔ اور جاگیر دارانہ نظام صنعتی نظام میں تبدیل ہو رہا تھا۔ اور بس شیکسپیئر کی شاعری اسی ذہنی اور معاشی کشمکش اور بدلتے ہوئے دَور۔ اور انگریزوں کی بڑھتی ہوئی صنعتی اور سرمایہ دارانہ طاقت کا پیش خیمہ ہے شیکسپیئر یقیناً موجودہ دَور کی ترجمانی نہیں کرتا۔ انگلستان کے موجودہ سامراجی نظام کو بہترین صورت میں پیش کرنے والا کپلنگ ہے۔ اگر غدر کی سیاست اور قنوطیت کا مظہر غالب ہے۔ تو اقبال کی پرخروش سیاسی شاعری موجودہ دَور میں مسلمانوں کے متوسط طبقہ کی بڑھتی ہوئی بیداری کو خصوصاً اور عام متوسط طبقہ کے معاشی و ذہنی ہیجان کو عموماً نہایت واضح صورت میں پیش کرتی ہے۔ ادب زندگی سے باہر نہیں جا سکتا۔

یہاں تک تو معاملہ صاف ہے کہ ادب زندگی کی عکاسی کرتا ہے۔ چاہے وہ الف لیلہ کی بظاہر خیالی کہانی ہو یا الطاف کی انقلابی شاعری۔ اب سوال رہ گیا کہ کونسا ادب اچھا ہے؟ اور کونسا ادب بُرا۔ بالفاظ دیگر کونسی زندگی اچھی ہے اور کونسی بُری؟ انسانی زندگی کے ارتقا میں اگر آپ نظرِ عمیق دیکھیں گے۔ تو آپ کو انسان جماعتوں میں بٹے ہوئے نظر آئیں گے۔ قبیلے اور قبیلوں کے سردار، مالک اور اُن کے غلام، جاگیردار اور جاگیرداروں کے مزارعین، آگے چل کر سرمایہ دار اور مزدور، سامراج اور غلام نوآبادیات کے لوگ۔ بس انسانوں کی تفریق کچھ اسی طرح ہے۔ اور یہی تفریق برابر دُنیا کے ہر ادب میں پائی جاتی ہے۔ کیونکہ ادب زندگی کا عکس ہے۔ ایک ادب وہ ہے جو بالواسطہ یا بلاواسطہ طور پر قبیلہ کے سرداروں، مالکوں اور جاگیرداروں، سرمایہ داروں اور سامراج پسندوں کی حمایت کرتا ہے۔ اور اس طرح سے شاعر کے اپنے جماعتی رجحان کو ظاہر کرتا ہے۔ دوسرا ادب وہ ہے جو اس کے مقابلے پر قبیلے کے حسیات و جذبات، غلاموں، مزدوروں، اور نوآبادیاتی لوگوں کی ترجمانی کرتا ہے۔ اور میرے لئے اور میرے بہت سے ساتھیوں کے لئے اور اس لئے ادب کے متعلق بھی بس یہی زاویہ نگاہ ہے۔ کہ وہ ہر چیز جو مؤخر الذکر لوگوں کی حمایت کرتی ہے اچھی ہے۔ اور جو ان کی مخالفت کرتی ہے۔ یا خاموش رہ جاتی ہے بُری ہے۔ اسے ممکن ہے ایک تنگ اور محدود زاویہ نگاہ کہا جائے لیکن اس کا کیا کیا جائے۔ کہ یہ جماعتی حد بندیاں شاعری پر بھی اثر انداز ہوتی ہیں۔ جو شاعری سرمایہ داروں کو خوش کر سکتی ہے۔ وہ مزدور پیشہ لوگوں کے جذبات کو

دیباچہ

کرشن چندر ایم۔اے

الطاف کی شاعری میں مجھے ایک نئے رنگ کی جھلک نظر آتی ہے۔ وہ شاعری اور وہ رنگ جو متقدمین میں قطعاً مفقود ہے۔ اس سے میری مراد کسی شاعر کی تحقیر نہیں۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ ادب زندگی کی پیداوار ہے۔ آج تک دنیا کے کسی بڑے سے بڑے شاعر یا ادیب نے ایک لفظ بھی ایسا نہیں کہا۔ جسے "ادب برائے ادب" کہا جا سکے۔ ادب برائے ادب" محض ایک خیالی ڈھکوسلہ ہے۔ اور کچھ نہیں۔ ورنہ دنیا کے ہر ایک ادب کا خمیر زندگی ہی سے اٹھا ہے۔ ادب کی اول اور انتہا "زندگی" ہے۔ ادب اچھا ہو سکتا ہے اور بُرا بھی۔ اور اچھا ہونا اور بُرا ہونا بھی محض اضافی اصطلاحیں ہیں۔ اور ادب کی اچھائی یا بُرائی کسی خاص زاویۂ نگاہ پر منحصر ہوتی ہے لیکن ادب چاہے اچھا ہو یا بُرا۔ زندگی سے باہر نہیں جا سکتا۔ ادب کا منبع زندگی ہے۔ اور اس کا منتہائے مقصود بھی زندگی۔

مثال کے طور پر شکسپیئر کو لیجیے۔ انگلستان کا بہترین شاعر، لیکن بہترین اس لئے نہیں کہ اس کی شاعری اور زبان میں چند ایسے خواص ہیں جو "ادب برائے ادب" کے معیاری اصول پر پورے اُترتے ہیں۔ اور اس لئے شکسپیئر کا نام "تا ابد زندہ رہیگا۔ بہترین اس لئے نہیں کہ وہ چاسر کے زمانے سے لیکر جیمس میکلٹن تک انگریزی زندگی کے ارتقائی پہلوؤں پر حاوی ہے۔ یہ بات صریحاً غلط ہے، گو میں سمجھتا ہوں۔ کہ اکثر انگریز نقاد جو کھاتے پیتے متوسط طبقہ سے تعلق رکھتے ہیں، شکسپیئر کی شاعری میں انگریزی زندگی تو کیا جہان بھر کی قوموں اور دنیا کے انسانوں کی زندگی کا عکس دیکھتے ہیں۔ اور نہ صرف زندگی کا عکس بلکہ کچھ اس سے بھی بڑھکر۔ یعنی خالص ادب، ایسا ادب جو زندگی سے الگ ہے اور جس کا وجود غالباً ان انگریز نقادوں کے دماغوں کے علاوہ اور کہیں نہیں۔ درحالیکہ

فہرست مضامین

شباب

انتساب!

نیاز احمدؔ پی۔ اے۔ ایس کے نام

جو

پی۔ اے۔ ایس ہونے کے باوجود اُردو ادب کی
منفرد شخصیتوں میں شمار کیے جاتے ہیں۔

خلوص کار
الطاف مشہدیؔ

۲۰-۵-۷۵

ضروری امور

✱

(۱) مصنّف کی دیگر مطبوعات ——— "تصویرِ احساس" "الطاف کے گیت" "ڈگر، پریت کے گیت، الطاف کے سپنے، ریحانہ"

✱

(۲) مصنّف کی پیدائش ——— ۱۰ فروری ۱۹۱۴ء

✱

(۳) مصنّف کا پتہ ——— ایڈیٹر ماہنامہ "ہم لوگ" بلاک نمبر ۱۸ سرگودھا

✱

داغ نیل

از

الطاف مشہدی

عوامی کتب خانہ بلاک ۱۸ سرگودھا (پاکستان)

(باہتمام ذکاء اللہ ثنائی پرنٹر ثنائی برقی پریس میں چھپ کر عوامی کتب خانہ بلاک نمبر ۱۸ سرگودھا سے منظر عام پر آئی)